ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

فروری ۲۰۲۵ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

۱۵/روپے

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اور پرنسپل سکریٹری جناب سنجے پرساد "پولیس منتھن" پروگرام میں کتاب کا اجراء کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ پولیس محکمہ کی خاتون افسر کو اعزاز دیتے ہوئے۔

جلد:79 شمارہ:10

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

فروری ۲۰۲۵ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

پبلشر: جناب وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب اروند کمار مشر (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

آسیہ خاتون

7705800986

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرسالانہ:

صباعرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکجرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

زرسالانہ: ۱۸۰ روپئے

ترسیل زرکاپتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اترپردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ	اپنی بات	۲
مضامین		
فضل الحق اور لیڈی برابورن کالج، کلکتہ	ڈاکٹر محمد منصور عالم	۳
رومانی دنیائے ادب کا قائد: سجاد حیدر یلدرم	ایم اے کنول جعفری	۹
ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سیاست اور پیغام	سوریہ پرکاش راؤ	۱۲
بلونت سنگھ کی نگارشات میں دیہی مسائل	ڈاکٹر سنتوش کمار جے ہند	۱۵
شارب ردولوی کی ادبی خدمات	محمد طلحہ	۲۰
منظومات		
غزل	اقبال اکرم وارثی	۱۴
غزلیں	شعیب نظام / سنجے مصر اشوق	۲۲
غزلیں	مدہوش بلگرامی / شازیہ خان	۲۳
غزل	کوثر پروین کوثر	۲۵
افسانہ		
ٹوٹتی قدریں اور چہرے	اشفاق برادر	۲۴
ایکٹولائف	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۲۶
پہچان	فضل ممتاز	۲۹
تبصرہ		
دیوار کے اُس پار	مبصر: وقار سیف	۳۱
ترقیات		
اترپردیش کھادی و دیہی صنعت ریاست کی ترقی کا ستون	سید نازش احمد	۳۲

ماہنامہ نیا دور، information.up.nic.in ویب سائیٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپئے — سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپئے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپئے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپئے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای: میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام ترمشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہرحال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

فروری ۲۰۲۵ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

''ماہنامہ نیا دور'' کا یہ موضوعاتی اداریہ ''منشی امیر احمد مینائی'' کی نایاب غزل کے مطلع سے ماخوذ ہے۔ امیر مینائی دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تھے، نواب نصیر الدین حیدر کے عہد سن 1828 میں پیدا ہوئے۔ استاد مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد اور داغ دہلوی کے معاصر تھے، امیر مینائی اور داغ دہلوی کے دوستانہ مراسم بہت اچھے تھے، اس کے باوجود مشاعروں میں ان کے درمیان ہونے والی چشمکیں کافی مشہور ہیں۔ خاص کر زیر تحریر اداریہ میں امیر مینائی کے اس المیاتی شعر کو معرض عنوان میں لانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ، ہم جس دنیا میں رہتے ہیں یہاں کی ساری آسائشیں، زندگی کی رنگا رنگی، قوت و اقتدار کی نمائش آپسی رشتوں کی رسا کشی، شور و ہنگامے اور یہ ہاؤ ہُو محض گردش وقت کے ناقابل افسوس خمیازہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دنیا کی ساری چیزیں کسی نادیدہ قوت کی پابند ہیں، جس کا مشاہدہ ہم زندگی کے روزمرہ میں کرتے رہتے ہیں۔ جس کی تازہ مثال اردو شعر و ادب سے متعلق وہ شخصیات ہیں جو اچانک اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئیں۔ میں جن کا تذکرہ ضروری سمجھتی ہوں، اس لئے کہ وہ شخصیات تھیں، جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ زبان و ادب کی خدمات میں صرف کیا، اور اپنے خون جگر سے اس چمن کی آبیاری کی، اس نئے سال کے آغاز میں ہونے والے سانحہ مرگ نے ہمیں رنجیدہ کر دیا، طاہر فراز کا انتقال مشاعرے کے عالمی اسٹیج کے لئے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا، جس کو پُر ہونے میں ایک زمانہ لگے گا، مرحوم کی دلپذیر آواز برسوں تک شائقین کے کانوں میں رس گھولتی رہیں گی۔

ڈاکٹر اختر سعید مسیحا جونپوری ایک بہترین محقق و نقاد تھے خاص کر ''جونپور کا ادبی منظر نامہ'' کے عنوان سے اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، اُن کی محققانہ صلاحیت پر دلالت کرتا ہے، یہ موضوع اس لئے منفرد ہے چونکہ جونپور ادبی حوالے سے ایک دبستان کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں کی زرخیز مٹی نے سیکڑوں ادیب و نقاد کو جنم دیا لیکن جن کے ادبی باقیات آج ناپید ہو چکے ہیں، ضروری ہے کہ اُن باقی ماندہ آثار کی دریافت کی جائے لیکن یہ ایک ایسا کام ہے جس کے انجام دہی کے لئے کسی ادبی مرد قلندر کی ضرورت ہے، اور اب ایسے لوگ اردو دنیا میں خال خال ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ مرحوم احمد وصی کا انتقال بھی ایک بڑا خسارہ ہے مرحوم ممبی ''وودھ بھارتی ریڈیو'' میں اناؤنسر تھے، انھوں فلموں اور ڈراموں میں اسکرپٹنگ اور نغمے وغیرہ بھی لکھے۔ اچانک اسطرح کے رونما ہونے والے واقعات وسانحات ہماری روح اور دل پر جب اثر انداز ہونے لگتے ہیں تو کچھ ایسے اشعار ہیں جو بے ساختہ ہماری زبان کا ورد بن جاتے ہیں۔ امیر مینائی کے غزل کا مکمل مطلع اور ایک شعر آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

آسیہ خاتون

یہ شمارہ فروری ۲۰۲۵ء کا ہے جس کو فروری ۲۰۲۶ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد منصور عالم
۱۷۲/۲/ایچ۔۹، اسمتھ لین، کولکاتہ
9903132988

فضل الحق اور لیڈی برابورن کالج، کلکتہ

1924ء میں اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) کے سنگ بنیاد کے بعد 1939ء میں ''لیڈی برابورن کالج'' کا قیام اے۔کے فضل الحق کا دوسرا سب سے بڑا تعلیمی کارنامہ تھا۔ پہلے اس کالج کا نام ''پردہ کالج'' رکھا گیا تھا بعد میں 'لیڈی برابورن کالج' کے نام سے موسوم ہوا جو صرف بنگال ہی نہیں بلکہ پورے ہندستان کی خواتین کی تعلیم کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم خواتین کی تعلیم کے حوالے سے نمایاں اقدامات اٹھائے گئے۔ 1938ء میں اسمبلی کے مسلمان اراکین نے مسلم لڑکیوں کے لیے علیحدہ تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا اس بنیاد پر کہ عام مسلمان غریب، ناخواندہ اور پردہ نشین ہیں اس لیے وہ غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ تعلیم حاصل نہیں کرسکتیں۔ اس موقع پر اس بات پر زور دیا گیا کہ اگرچہ متمول اور روشن خیال طبقے کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی ہیں مگر دیہات اور شہروں کے عام مسلمان گھرانے اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلوانے سے قاصر ہیں لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں جب مرہٹوں کی شکست کے بعد برطانوی اقتدار کو ہندوستان میں آخری اہم چیلنج ختم ہوا تو نسبتاً پرامن حالات میں برطانوی حکمتِ عملی نے ہندستانی علاقوں میں انتظامی اور تعلیمی پالیسیوں کو واضح کرنا شروع کیا۔

تعلیم کے میدان میں فورٹ ولیم (بنگال) کے پہلے برطانوی گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی میں ابتدائی اقدامات کئے۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدیم علمی ورثے کو زندہ کرنے پر زور دیا اور اسی مقصد کے تحت 1781ء میں کلکتہ مدرسہ اور 1784ء میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی گئی۔ اس کے بعد 1792ء میں بنارس میں سنسکرت کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ تاہم لارڈ ولیم بینٹنک (گورنر جنرل 1835-1828ء) کے دور میں یہ پالیسی بدل دی گئی۔ لارڈ میکالے نے 1835ء کی اپنی مشہور رپورٹ میں تجویز دی کہ سرکاری تعلیمی فنڈ زصرف مغربی تعلیم کے فروغ پر خرچ کئے جائیں اور بینٹنک نے اسے قبول کرلیا۔ اس پالیسی کے اثرات آنے سے پہلے ہی مسیحی مشنریوں اور جدید فکر رکھنے والے ہندوستانی شخصیات خصوصاً راجہ رام موہن رائے نے مغربی تعلیم کے فروغ کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ حکومت کی نئی پالیسی نے اس تحریک کو نئی قوت بخشی۔ بعد میں لارڈ ہارڈنج (گورنر جنرل 1848-1844ء) نے سرکاری ملازمتوں میں انگریزی تعلیم کو ترجیح دی جس سے مغربی تعلیم کی ترقی اور تیز ہوگئی۔(۱)

اگرچہ یہ پالیسی عوامی تعلیم کے فروغ میں ناکام رہی مگر خوشحال متوسط طبقے میں مغربی تعلیم کو عام کر دیا۔ اس نئے تناظر میں ہندو اور مسلم برادریوں کے درمیان تعلیمی ترقی میں فرق شروع سے ہی نمایاں تھا۔ مسلمانوں کے لئے یہ نئی تعلیمی پالیسی دراصل ان کی اس مراعات یافتہ حیثیت کا خاتمہ تھی جو نصف صدی سے زیادہ عرصے تک فارسی کے درباری زبان ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل تھی۔ کلکتہ مدرسہ خاص طور پر عربی و فارسی زبان اور اسلامی قانون کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا تاکہ عدالتی افسران تیار کیے جاسکیں۔ نئی پالیسی کو مسلمانوں نے ناپسند کیا اور انگریزی تعلیم سے دور رہے جسے وہ شک اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تعلیم کو مذہبی ہدایت سے الگ کرنا مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول تھا۔ لارڈ رپن (گورنر جنرل 1884-1880ء) کے مقرر کردہ کمیشن نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجوہات یوں بیان کیں:

> ''بیسویں صدی کے آغاز سے حکومتِ بنگال نے مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ اقدامات شروع کئے تھے۔ 1919ء میں کلکتہ میں مسلمان خواتین اساتذہ کے لیے ٹریننگ کلاس کھولی گئی اور مسلم طالبات کے لیے وظائف مختص کیے گئے۔ پانچ سرکاری گرلز ہائی اسکولوں میں سے صرف ایک میں فارسی و عربی کی تعلیم کی سہولت دی گئی۔ کچھ خاص کلاسیں پردہ نشین خواتین کے لئے مختلف مراکز پر کھولی گئیں لیکن 1933 میں یہ ختم کر دی گئیں۔ مسلم طالبات کی کالج تعلیم کی صورتحال بدترین تھی، حتیٰ کہ 1932 میں بھی بنگال کے موجودہ چار گرلز آرٹس کالجوں میں صرف آٹھ مسلمان طالبات زیرِ تعلیم تھیں جو کل طالبات کا صرف ایک فیصد تھیں۔ ان میں سے کسی کالج میں بھی عربی یا فارسی کی تدریس کا انتظام نہ تھا۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی طرف سے اپنی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے مطالبات اٹھنے لگے۔''

''ایک صاف گو مسلمان یہ تسلیم کرے گا کہ سب سے طاقتور عوامل نسلی غرور، ماضی کی برتری کی یاد، مذہبی خدشات اور اسلامی تعلیمات سے فطری وابستگی ہیں۔''(۲)

انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے تک صورتحال بدلنے لگی۔ ایک بڑی تعداد میں مسلمان انگریزی سیکھنے لگے اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی اسکول میں داخل ہوئے۔ لیکن اعلیٰ انگریزی تعلیم ابھی تک مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر نہ پھیل سکی تھی۔ صدی کے اختتام تک مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے خلاف تعصب ماضی کی چیز سمجھا جانے لگا۔ جدید تعلیم کے فروغ میں مسلمانوں کی پیش رفت کی راہ میں اصل رکاوٹیں ان کی غربت اور وہ خصوصی سہولیات کی کمی تھیں جو انہیں ہندو ہم عصروں کے ساتھ کامیابی سے مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکتیں۔(۳) 1916ء میں حکومت کی مقررہ کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر گورنر آف بنگال ان کونسل نے 3 اگست 1916ء کو ایک قرارداد منظور کی:

''ملک کی ترقی، سیاسی اور دیگر تمام پہلوؤں میں، اس بات پر منحصر ہے کہ دونوں بڑی قومیں یکساں طور پر تعلیمی ترقی کریں اور موجودہ مواقع سے یکساں فائدہ اٹھا سکیں اور مستقبل میں میسر آنے والے وسیع تر مواقع سے بھی۔ حکومت ہند چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو معقول تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ گورنر جنرل ان کونسل کا یقین ہے کہ حکومت اور عوام دونوں کے مفاد میں ہے کہ مسلمانوں کو جنہیں اب بھی اپنے تعلیمی نقصان کی تلافی کرنی ہے، ایسی خصوصی سہولتیں دی جائیں جو انہیں ہندوؤں کی طرح سرکاری تعلیمی اداروں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے قابل بنا سکیں''۔

اسی مقصد کے تحت 1924ء میں کلکتہ میں اسلامیہ کالج قائم کیا گیا تا کہ مسلمان طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کی بہتر سہولت فراہم ہو(۵) اور اس سے قبل 1920ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی تا کہ ان میں یونیورسٹی تعلیم کو پھیلایا جا سکے(۶) لیکن بیسویں صدی کے وسطی چالیس کی دہائی میں بھی مسلم لڑکیوں کی تعداد مڈل اور ہائی اسکولوں میں بہت کم تھی اگرچہ ابتدائی سطح پر صورتحال کچھ بہتر تھی۔ مسلمان اب اپنی بچیوں کی تعلیم سے غافل نہ تھے لیکن ان کے لئے موزوں سہولتیں نایاب تھیں۔ کمیونٹی کی عمومی غربت کے علاوہ لڑکیوں کے ہائی اسکولوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم کا فقدان، امدادی اسکولوں کی مینیجنگ کمیٹیوں میں مسلمانوں کی ناکافی نمائندگی، لڑکیوں کو دوسرے علاقوں میں بھیجے جانے کی مشکلات، پردہ نظام کے مطابق اسکولوں کی کمی، لڑکیوں کے لیے نقل وحمل کا ناقص انتظام، دینی تعلیم کی سہولتوں کا فقدان، ہاسٹل نہ ہونا، ابتدائی سطح پر ترکِ تعلیم کی بلند شرح، بھاری فیسیں اور حکومت کی جانب سے ناکافی مالی امداد یہ سب اسباب تھے جن کی وجہ سے مسلم خواتین کی تعلیم کی رفتار سست رہی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے حکومتِ بنگال نے مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ اقدامات شروع کئے تھے۔ 1919ء میں کلکتہ میں مسلمان خواتین اساتذہ کے لیے ٹریننگ کلاس کھولی گئی اور مسلم طالبات کے لیے وظائف مختص کیے گئے۔ پانچ سرکاری گرلز ہائی اسکولوں میں سے صرف ایک میں فارسی و عربی کی تعلیم کی سہولت دی گئی۔ کچھ خاص کلاسیں پردہ نشین خواتین کے لئے مختلف مراکز پر کھولی گئیں لیکن 1933 میں یہ ختم کر دی گئیں۔ مسلم طالبات کی کالج تعلیم کی صورتحال بدترین تھی، حتیٰ کہ 1932 میں بھی بنگال کے موجودہ چار گرلز آرٹس کالجوں میں صرف آٹھ مسلمان طالبات زیرِ تعلیم تھیں جو کل طالبات کا صرف ایک فیصد تھیں۔ ان میں سے کسی کالج میں بھی عربی یا فارسی کی تدریس کا انتظام نہ تھا۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی طرف سے اپنی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے مطالبات اٹھنے لگے۔ ابتدا میں زور دیا گیا کہ کلکتہ کے بیتھون کالج اور ڈھاکہ کے ایڈن انٹرمیڈیٹ کالج میں فارسی یا عربی کے اساتذہ مقرر کئے جائیں۔ تیسری دہائی کے اواخر سے مسلم لڑکیوں کے لئے الگ کالج اور الگ ہوسٹل کا مطالبہ واضح ہو گیا۔ اسی زمانے میں حکومت کے سامنے یہ سوال شدت سے اٹھایا گیا۔(۷)

مسلم لڑکیوں کے لئے کالج:

مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کی بہت سی وجوہات ہیں جنھیں یہاں بیان کرنا فضول ہے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے بہت پچھڑے ہوئے تھے جس سے ان کی عام زندگی کا معیار بہت گر گیا تھا۔ گورنمنٹ کے انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت جب صوبوں کو خود مختاری دی گئی تو مسلمانوں کو بھی صوبائی حکومت کے معاملات میں خدمت کا موقع ملا۔ اس کے بعد لوگ تعلیم کی طرف تھوڑی توجہ دینے لگے۔ مسلم لڑکیوں کے لئے 36 غیر سرکاری اسکول جو پریسیڈنسی اور ضلع بردوان اور کلکتے میں تھے سرکاری گرانٹ کی رقم پر چل رہے تھے۔ محکمہ تعلیم کے لئے مجموعی 79,000 ہزار روپے مخصوص تھے جن سے ان اسکولوں کو 10,996 روپے ملتے تھے۔ مسلم لڑکیوں کے ایک ثانوی اسکول کو 20 ہزار گرانٹ کی رقم ملتی تھی۔ اس کے علاوہ کے۔ اے۔ جی سہروردی بیگم میموریل اسکول اور دوسرا ایم۔ ایس اور ثانوی اسکول بھی کلکتہ میں تھے۔ موخر الذکر اسکول 198 نمبر لوئر سرکلر روڈ، کلکتہ میں واقع تھا۔ مسلم لڑکیوں کے لئے چار غیر سرکاری اسکول ضلع بردوان اور کلکتہ میں تھے۔ ان میں سب سے پہلے مسلم لڑکیوں کے لئے ایک مدرسہ شمسیہ کے نام سے 1898ء میں مٹیا برج میں قائم ہوا تھا جو بعد میں مڈل اسکول ہو گیا۔

چونکہ مسلم لڑکیوں کے اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا اس لئے وہ کلکتے کے مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ 1938ء میں مسلمان اراکین اسمبلی نے مسلم لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبے کے جواز میں انہوں نے اس حقیقت پر زور دیا کہ عام مسلمان غریب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی عورتیں پردہ نشین ہیں اس لئے وہ ہندو طالبات کے ساتھ شانہ بہ شانہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ چند متمول اور روشن خیال مسلمان گھرانوں کی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں دشواری نہیں آتی لیکن دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں بسنے والے 95 فیصد مسلمانوں کی لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے۔ انہی مشکلات کے پیشِ نظر مسلمانوں کے نمائندوں نے مسلم لڑکیوں کے لئے ایک علیحدہ کالج کے قیام کا مطالبہ کیا۔(۸)

بحث کے دوران ایک رکن نے وضاحت کی کہ مسلم لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں مکمل طور پر دوسرے فرقوں سے الگ تھلگ کر کے گھر کی چار دیواری میں محصور رکھا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی مخصوص تہذیبی فضا اور سماجی آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں۔ حزبِ مخالف کے اراکین نے یہ اعتراض اٹھایا کہ مسلم لڑکیوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ اس منصوبے پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔ اس کے جواب میں ایک رکن نے کہا کہ یہ اعتراض بالکل بے موقع ہے کیونکہ ماضی میں بھی ایسے مواقع آئے

ہیں جب ابتدا میں تعداد کم تھی لیکن سہولت فراہم کرنے کے بعد وہ بڑھتی گئی۔ بطور مثال انہوں نے روم (Rome) کے ایک کالج کا حوالہ دیا جو صرف چند طلبہ کے ساتھ شروع ہوا تھا اور آج وہاں بڑی تعداد میں طالبات تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

اسی سال 1938ء میں وزیرِ اعلیٰ اے۔کے۔فضل الحق نے اسمبلی میں اعلان کیا کہ ایک نئے منصوبے کے تحت مسلم لڑکیوں کے لیے علیحدہ کالج کی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس منصوبے میں ہوسٹل اور تدریسی عمارت دونوں شامل تھے اور اس مقصد کے لیے سات لاکھ دس ہزار روپے کی گرانٹ منظور کی گئی۔ وزیرِ اعلیٰ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ جب تک نئی عمارت تیار نہیں ہو جاتی تدریسی سرگرمیاں کرایے کی عمارت میں شروع کر دی جائیں گی۔ وزیرِ اعلیٰ اے۔کے۔فضل الحق نے اسی سال مسلم طالبات کے لیے علیحدہ عمارت کی تعمیر اور ہوسٹل کے قیام کا اعلان کیا اور ابتدائی طور پر کرایہ کے مکان میں کلاسز شروع کرنے کا انتظام کیا۔ 1939ء میں باقاعدہ اس عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ کچھ عرصے بعد پارک سرکس کے علاقے میں نئی اراضی حاصل کی گئی اور یہاں مسلم طالبات کے لئے علیحدہ اسکول، تربیتی مرکز اور ہوسٹل قائم کیا گیا۔ اس دوران وزیرِ اعلیٰ نے اسلامی تہذیب کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے پردہ نشین طالبات کے لئے خصوصی سہولتیں فراہم کیں، مثلاً پردہ دار بس، قیام و طعام میں آسان شرائط اور غریب لڑکیوں کے لئے وظائف۔

اس مقصد کے تحت 12 دسمبر 1939ء کو صوبے کے سابق گورنر کی وفات کے بعد ان کی یاد میں کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ باقاعدہ افتتاح 9 جنوری 1939ء کو وزیرِ اعلیٰ فضل الحق اور اس وقت کے بنگال سرویئر جنرل نے 106 پارک اسٹریٹ میں انجام دیا۔(۱۰)

لیڈی برابورن کالج اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک تاریخی منصوبہ تھا۔ اس کی پہلی منزل کی تکمیل کے بعد افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ دوسری اور تیسری منزل کے مکمل ہونے پر بھی الگ الگ تقریبات ہوئیں۔ افتتاحی جلسوں میں مشہور عالم دین فضل الرحمان نظامی نے شرکت کی اور وزیرِ اعلیٰ فضل الحق نے اپنی تقریر میں اس منصوبے کو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا سنگ میل قرار دیا۔(۱۱) اس مقصد کے لئے حکومت نے پارک سرکس کے علاقے میں 20 بیگھہ رقبے پر مشتمل ایک قطعہ زمین 10,441 روپے میں خریدا۔ حقیقتاً یہ کالج اور ہوسٹل 18 بیگھہ زمین پر قائم کئے گئے۔ وزیرِ اعلیٰ نے اس موقع پر یہ بھی اعلان کیا کہ اس احاطے میں ایک 'صفدر میموریل انگلش اسکول' قائم کیا جائے گا، ایک تربیت گاہ اور ایک ہوسٹل مسلم طالبات کے لئے مخصوص ہوں گے۔ اساتذہ اور پروفیسروں کی تقرری میں غیر ملکی ماہرین بھی شامل کئے گئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ "کالج میں ہر سال مسلم لڑکیوں کے لیے خصوصی داخلے ہوں گے"۔ اپنی تقریر میں وزیرِ اعلیٰ نے اس بات پر زور دیا کہ "اسلامی تہذیب و ثقافت کے ماحول میں تعلیم فراہم کی جائے تاکہ پردہ نشین مسلمان لڑکیاں بھی سہولت سے پڑھ سکیں"۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ بعض مسلم لڑکیاں دیہات سے کلکتہ پڑھنے آئیں تو انہیں غیر مسلم ساتھیوں کے ساتھ بورڈنگ میں رہنا پڑا جہاں نہ ان کی عبادت کا انتظام تھا اور نہ ہی کھانے میں اسلامی اصولوں کی رعایت ملتی تھی، چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ قیام و طعام کے اخراجات نہایت کم ہوں گے۔ قیام کے لیے دس روپے اور تعلیم کے لیے چار روپے فیس مقرر کی گئی جبکہ غریب طالبات کے لیے کثرت سے وظائف دیئے جائیں گے۔ طالبات کی آمد و رفت کے لیے ایک پردہ دار بس بھی چلائی گئی جس کا ماہانہ کرایہ محض دو روپے رکھا گیا۔(۱۲)

وزیرِ اعلیٰ کی تقریر کے بعد اہلِ شہر اور ممتاز مہمانوں نے دل کھول کر چندے، وظائف اور انعامات دینے کا اعلان کیا۔ بالآخر 1931ء میں عمارت مکمل ہونے کے بعد کالج کو اس نئے احاطے میں منتقل کر دیا گیا۔ تاہم دوسری جنگِ عظیم کے دوران کالج اور ہوسٹل کی عمارتیں فوج کی رہائش کے لئے لے لی گئیں جس کے نتیجے میں 1942ء کے بعد اس کی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس موقع پر کالج کو عارضی طور پر سہروردی روڈ پر قائم ایک کرایہ کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ جنگ کے دنوں میں تعلیمی سرگرمیوں میں تعطل ضرور آیا لیکن تدریس کا سلسلہ خط و کتابت کے ذریعے جاری رکھا گیا جو بہت مؤثر ثابت ہوا۔ اس دور میں کالج کی پہلی پرنسپل ایف۔ای۔سی گروسی کی خدمات خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں۔

چار برس کے وقفے کے بعد جون 1939ء میں یہ ادارہ دوبارہ اپنی اصل حالت میں آ گیا۔ تاہم اگست 1939ء میں شہر میں ہونے والے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات نے اس کے حالات کو بری طرح متاثر کیا۔ ان دنوں یہ ادارہ متاثرین فساد کے لئے امدادی مرکز کے طور پر بھی استعمال ہوا۔ نومبر 1939ء میں تعلیمی سرگرمیاں بحال ہوئیں اور اس کے بعد معمولات بڑی خوش اسلوبی سے جاری رہے۔ آزادی کے بعد بھی اس ادارے نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا اور آج تک یہ نہ صرف تعلیم بلکہ تہذیبی اقدار کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کے بعض حلقوں کی طرف سے ایسے پردہ کالج کے قیام کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس نوعیت کے منصوبے غیر ضروری اور رجعت پسندانہ ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ یہ تعلیمی ضرورت کے بجائے سیاسی مقاصد کے تحت لائے جا رہے ہیں۔ پردہ کو اعلیٰ تعلیم کے تصور کے ساتھ بالکل ناموزوں قرار دیا گیا۔ یہ بھی تجویز دی گئی کہ ایسے پردہ کالج کے لئے فراہم کردہ رقم کو ہندو، مسلم اور عیسائی لڑکیوں کے لئے کلکتہ میں ہوسٹل بنانے پر خرچ کیا جانا چاہیے۔ اسی احساس کو ان الفاظ میں بھی ظاہر کیا گیا:

> "کیا یہ ضروری نہیں کہ حکومت لڑکیوں کی تعلیم کے پورے سوال کے بارے میں بشمول ان کے قیام و رہائش کے مسئلے پر، کوئی واضح پالیسی اختیار کرے؟ یہاں تک کہ کالج کے قیام سے قبل جولائی 1939 میں ہی سرکاری سطح پر بھی یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ مجوزہ کالج کو صرف مسلمان لڑکیوں تک محدود رکھنے میں عملی مشکلات ہیں۔ مسلم لڑکیوں کی مطلوبہ تعداد داخلے کے لئے سامنے نہیں آ رہی تھی اس لیے یہ رائے بھی سامنے آنے لگی کہ کالج کو دوسری برادریوں کی لڑکیوں کے لئے بھی کھولا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مالی سال 38-1937ء کے لئے مجوزہ کالج کے اخراجات سے متعلق جو بجٹ تخمینہ پیش کیا گیا اس میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں تھا کہ یہ کالج صرف مسلم لڑکیوں کے لیے ہوگا"۔

اس بارے میں حکومت کا موقف ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> "جہاں تک اس نئے کالج کا تعلق ہے تو اسے ایک بالکل نئے منصوبے کے تحت تعمیر کیا جائے گا۔ یہ ایک رہائشی کالج ہوگا جس کے ساتھ ہوسٹل اور ہسپتال منسلک ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مسلم برادری کی ضروریات کو بھی پورا کرے گا۔ 39-1938ء کے دوران صوبے میں تعلیم کی حالت پر حکومت کی جاری کردہ رپورٹ میں کہا

گیا کہ حکومت نے کلکتہ میں مسلم لڑکیوں کے لیے ایک نئے کالج کے قیام کی اسکیم منظور کرلی ہے''۔

1939-40ء کی رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ یہ کالج بنیادی طور پر مسلم لڑکیوں کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مجوزہ کالج کا نام لیڈی برابورن کالج رکھا گیا جو بنگال کے گورنر لارڈ برابورن کی اہلیہ کے نام پر تھا، جو 23 فروری 1939ء کو وفات پاگئی تھیں۔ (۱۳)

کالج جولائی 1939ء میں پارک سرکس میں ایک کرائے کے مکان میں شروع ہوا جس کے لئے 1939-40ء کے بجٹ تخمینوں میں حکومتِ بنگال کی طرف سے اکہتر ہزار روپے فراہم کیے گئے تھے۔ کلکتہ امپرومنٹ ٹرسٹ نے اس زمانے میں اس علاقے میں کئی ترقیاتی اسکیمیں شروع کی تھیں۔ اسی نے سید امیر علی ایونیو تعمیر کیا جو پارک سرکس کو بالی گنج سے ملاتا تھا اور اس نے اس علاقے میں ایک وسیع پارک بھی بنایا جو اس وقت ایسٹرن پارک کہلاتا تھا۔ دستیاب ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کالج نے ابتدا میں محض پینتیس مسلم لڑکیوں کے ساتھ فنونِ لطیفہ (آرٹس) کے پہلے سال میں آغاز کیا۔ (۱۴)

ابتدائی تدریسی عملہ درج ذیل نو اراکین پر مشتمل تھا:

مس جین مکفیڈن، پروفیسر آف انگلش- مس شمس النہار محمود، پروفیسر آف بنگالی- مس فاطمہ بیگم، لیکچرران اردو- جناب رضا علی وحشتؔ، پروفیسر آف فارسی- مولانا عبد الخالق، پروفیسر آف عربی- ڈاکٹر رما چودھری، پروفیسر آف منطق اور فلسفہ- مسز بینا گھوش، پروفیسر آف تاریخ- مسز سنگید ھا پربھا مترا، پروفیسر آف ریاضی- مس کمالہ سین، لیکچرران سول سائنس اور اکنامکس جبکہ مسز صابرہ طیب اس ادارے کی بانی لائبریرین تھیں جن کا انتقال 21 دسمبر 1988ء کو ہوگیا۔ (۱۵)

اس زمانے میں رواج تھا کہ خواتین کے ادارے بالخصوص برطانوی حکام کی بیویوں کے نام سے منسوب کیے جاتے تھے، جیسے لیڈی ڈفرین وکٹوریہ ہسپتال۔ لارڈ برابورن 1895ء میں انگلینڈ کے ایک اشرافیہ خاندان میں پیدا ہوئے، برطانوی پارلیمان میں قدامت پسند مفادات کی نمائندگی کی اور دوسری جنگِ عظیم میں غیر معمولی فوجی خدمات پر ملٹری کراس حاصل کیا۔ بہت کم عمر میں وہ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے اور 1937ء میں گورنر بنگال بنے۔ بعد ازاں وائسرائے کے قائم مقام بھی رہے۔ ان کی وفات پر اُس وقت کے وزیر اعلیٰ اے۔ کے۔ فضل الحق (وزیر تعلیم، حکومت بنگال) نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

> ''ہم نے انہیں اپنا رہنما، فلسفی اور دوست سمجھا۔ ان کی عظیم شخصیت، علمی کارنامے، تجربات، نادر سیاست دانی، شائستگی اور ان کی شخصیت کا وہ دلکش اور ناقابل بیان حسن جس نے ہر ایک کو متاثر کیا۔ وہ بنگال کے سب سے مقبول انسان تھے اور آج ان کی کمی ہمیں بہت غریب بنا گئی ہے''۔ (۱۶)

کالج کے قیام کے وقت جن دیگر شخصیات کا تعلق اس سے رہا ان میں زہرہ خاتون کا نام قابل ذکر ہے جو فروری 1965ء تک کالج کی خدمت سے وابستہ رہیں۔

حکومت کی نیت ابتدا ہی سے یہ تھی کہ کالج کے لئے مستقل عمارت مہیا کی جائے چنانچہ جولائی 1939ء میں کالج کے آغاز سے پہلے ہی حکومت نے کلکتہ امپرومنٹ ٹرسٹ سے ایک قطعہ زمین خریدنے کی تجویز پیش کی جس کی قیمت 5,40,000 روپے تھی۔ یہ زمین اصل میں تین اداروں کے لیے مختص کی گئی تھی:

۱- مجوزہ کالج، ۲- سخاوت میموریل ہائی اسکول، ۳- مسلم فی میل ٹریننگ اسکول۔ لیکن ان تینوں اداروں کو ایک ہی جگہ پر قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا اور صرف کالج کی عمارت، پرنسپل کی رہائش اور کالج ہوسٹل کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ زمین کل 18 بیگھہ پر مشتمل تھی۔ 1939-40ء کے بجٹ میں ان عمارتوں کی تعمیر کے لئے دو لاکھ روپے مختص کیے گئے۔ 26 اگست 1939ء کو اس وقت کے گورنر بنگال سر جے۔ ووڈ ہیڈ نے سنگِ بنیاد رکھا۔ تعمیر 1941ء تک مکمل ہوگئی اور کالج جولائی اُسی سال اپنی موجودہ عمارت PL/2 سہروَردی ایونیو، کلکتہ-17 میں منتقل ہوگیا۔ (۱۷)

کالج کی زندگی کے پہلے ہی عشرے میں مثبت اور صحت مند تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ 1947ء کا سال یعنی آزادی ہند کا سال، کالج کی تاریخ میں ایک نئے دور کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ ہندستان نے خود کو ایک سیکولر ملک قرار دیا اور کالج نے بھی اسی نئے ماحول میں اپنی ترقی کا نیا سفر شروع کیا۔

آزادی کے بعد کالج نے اپنے فرقہ وارانہ رجحان کو ترک کر دیا اور اب یہ ایک خالص غیر فرقہ وارانہ ادارہ بن گیا ہے۔ کالج نے ایک کوزموپولیٹن حیثیت اختیار کر لی اور ملک کے مختلف حصوں سے طالبات یہاں داخلہ لینے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کالج میں تیزی سے توسیع بھی ہوئی۔ اگست 1949ء تک طالبات کی تعداد بڑھ کر 485 ہوگئی جبکہ تدریسی عملے کی تعداد 36 تک پہنچ گئی۔

کالج کی پہلی مستقل پرنسپل مس ایف۔ ای۔ گروز (M.A.Cantab) تھیں جنہوں نے 1940ء سے اگست 1947ء تک اپنی خدمات انجام دیں اور کالج کو ابتدائی دور کی مشکلات سے بخوبی نکالا۔ ان کے بعد مس سنیتی بالا گپتا (M.A.Leeds) جولائی 1948ء میں پرنسپل بنیں اور مختصر مدت کے دوران نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔

کالج کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہوگیا جس کے تحت سائنس میں انٹرمیڈیٹ سطح تک اور آرٹس میں گریجویشن تک تعلیم دی جانے لگی۔ آنرز مضامین میں انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، فلسفہ، سنسکرت، اردو اور فارسی شامل تھے۔ علاوہ ازیں کالج میں اردو، فارسی، عربی اور متبادل انگریزی کی تدریس کا بھی انتظام تھا۔ زیرِ بحث دور میں لائبریری اور طالبات کا ہوسٹل کالج کے دو نہایت اہم حصے بن گئے۔ 1948-49 میں لائبریری کی کتب کی تعداد بڑھ کر 10,770 تک جا پہنچی جو طالبات اور اساتذہ دونوں کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہو رہی تھی۔ لائبریری کا انتظام ایک خاتون لائبریرین کے سپرد تھا جن کی معاونت ایک لائبریری کمیٹی کرتی تھی جس میں تدریسی عملے کے کئی افراد شامل تھے اور کالج کی پرنسپل اس کی صدر تھیں۔

کالج کا ہوسٹل جو اسی مقصد کے لئے تعمیر کردہ سرکاری عمارت میں قائم تھا اور اس میں 1948-49ء کے تعلیمی سال کے دوران 96 طالبات کے قیام کی گنجائش تھی۔ اس میں ایک سپرنٹنڈنٹ (جو عملے کی رکن ہونا لازم تھا) اور ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے لئے علیحدہ کمرے مختص تھے، چونکہ ہوسٹل میں رہائش کی مانگ مسلسل بڑھ رہی تھی اس لیے اسی دور میں ایک کرایے کی عمارت میں توسیعی ہوسٹل کا انتظام کیا گیا جس میں 30 طالبات کے قیام کے ساتھ ساتھ دوسری اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے لیے بھی کمرے مہیا کیے گئے۔

پرنسپل کی رپورٹس 1948-49ء۔ (توسیعی ہوسٹل بعد میں مرکزی ہوسٹل میں ضم کر دیا

گیا جب وہاں ایک نئی منزل تعمیر کی گئی۔)

اس دور میں کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں کو منظم انداز میں آگے بڑھانے کے لیے مختلف کلب قائم کیے گئے، جن میں ڈیبیٹنگ کلب، میگزین کلب، کامن روم کلب اور سوشل سروس کلب شامل تھے۔ ہر کلب کا انتظامی ڈھانچہ ایک تدریسی رکن پر مشتمل ہوتا جو صدر کے فرائض انجام دیتا جبکہ دو یا تین دیگر اساتذہ اس کی معاونت کرتے اور ایک مخصوص تعداد میں طلبہ نمائندے بھی شامل کیے جاتے جن کا انتخاب خود طالبات کرتی تھیں۔ ہر تعلیمی سیشن کے آغاز پر ایک جامع پروگرام ترتیب دیا جاتا جس پر پورے سال عمل کیا جاتا۔ اس کے تحت مختلف علمی و فکری شخصیات کے لیکچر، تعلیمی اہمیت کی حامل فلموں کی نمائش، مباحثے، موسیقی اور تقاریر کے مقابلے منعقد کئے جاتے۔ اسی دور میں کالج میں نیشنل کیڈٹ کور (NCC) کی کلاسیں شروع کرنے کا منصوبہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ تعلیمی سال 49-1948ء میں کالج کے تدریسی عملے کے تین ارکان کو اس مقصد کے لئے دہلی میں فوجی تربیت کے لئے منتخب کیا گیا اور انہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ کا عہدہ عطا کیا گیا جو ان کے لئے ایک منفرد اعزاز تھا۔ کالج کے مختلف شعبوں مثلاً جغرافیہ، تاریخ، سنسکرت، فلسفہ، انگریزی اور نباتیات کے تحت تعلیمی سیر و سیاحت (Excursions) کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت پر بھی خاص زور دیا گیا۔ جمعہ کے دن کلاسیں 2:30 بجے ختم کر دی جاتیں اور طالبات کو ایک خاتون انسٹرکٹر کی نگرانی میں والی بال، بیڈمنٹن اور دیگر کھیلوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی جاتی۔ کالج کے سالانہ کھیلوں کی تقریبات ادارے کی اہم سرگرمیوں میں شمار ہوتی تھیں اور اس دوران کالج کی طالبات نے دوسرے اداروں میں بھی کھیلوں کے مقابلوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔

یہ نہایت دلچسپ ہے کہ کس طرح کلکتہ میں دوسری جنگ عظیم (45-1939ء) کے آخری مراحل میں جاپان کے برما کے ذریعے پیش قدمی کے بعد بمباری کے خوف اور بعد میں 1946ء کے ہندو-مسلم فسادات کے دوران کالج نے جتنی عملی طور پر ممکن ہو سکے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش کی۔ جنگ کے آغاز پر، کالج کے احاطے پر فوج نے قبضہ کر لیا اور کالج کو ڈیوڈ ہیئر ٹریننگ کالج، بالی گنج سرکلر روڈ منتقل کرنا پڑا۔ جب شہر میں بمباری کا خوف پھیلا اور بیشتر تعلیمی ادارے بند یا محفوظ مقامات پر منتقل کئے گئے۔ کالج نے کئی مہینوں تک خط و کتابت کے ذریعے کام جاری رکھا جسے اس وقت کی پرنسپل مس گروس نے نہایت شایانِ شان طور پر منظم کیا۔ (۱۸) کالج اپنے احاطے میں 1946ء میں واپس آیا مگر اسی سال کلکتہ میں انتہائی افسوسناک فسادات پھوٹ پڑے جس کی وجہ سے کالج تین ماہ کے لئے بند رہا اور اس کے احاطے کو فسادات کے متاثرین کے لئے پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کالج نومبر 1946ء میں دوبارہ کھولا گیا حتیٰ کہ جب شہر اور مضافات میں تشدد اور ہنگامے عام تھے۔ (۱۹)۔ اس کے باوجود اس کی مستقل ترقی جاری رہی اور طلبہ کی نصاب اور غیر نصابی سرگرمیوں میں کارکردگی روز بروز بہتر ہوئی۔ 1959ء تک یعنی کالج کی دوسری دہائی کے اختتام تک، طلبہ کی تعداد 750 تک پہنچ گئی اور اگست 1968ء میں تقریباً دس سال بعد یہ تعداد 950 تک جا پہنچی۔ 1970ء کی دہائی کے وسط سے یہ تعداد عام طور پر 1000 سے اوپر رہی۔ (۲۰) طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نئے شعبے قائم کیے گئے اور مزید سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یوں 1949ء میں تدریسی عملے کی تعداد 36 ہو گئی (پرنسپل سمیت)، 1959ء میں یہ تعداد 49 ہو گئی۔ (۲۱) 1968ء میں کالج کے تدریسی عملے کی تعداد 85 افراد پر مشتمل تھی اور 1980ء کی دہائی کے اوائل سے یہ تعداد عام طور پر اسی حد پر برقرار رہی۔

کالج کے مختلف شعبے اب سو سے زائد افراد کی خدمات حاصل کر چکے ہیں جن میں سے کئی افراد نے زندگی کے مختلف شعبوں میں قومی سطح پر نمایاں کارکردگی دکھائی ہیں۔ اس کا غیر تدریسی عملہ بھی مسلسل بڑھتا رہا اور 1980ء کی دہائی کے اوائل تک اس کی تعداد ستّر سے زائد ہو گئی تھی۔ یہاں بھی کالج نے محنتی اور مخلص افراد کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے کالج کے نظم و نسق کو بہتر بنانے میں مدد کی، پرنسپل کے انتظامی امور میں تعاون کیا، کالج کے احاطے کو صاف رکھا، باغات کی دیکھ بھال کی، طلبہ اور عملے کی مدد کی۔ لائبریری، لیبارٹریز اور کامن رومز میں سہولت فراہم کی، کالج کی املاک کے نقصان کو روکنے میں نگرانی کی اور دیگر کئی طریقوں سے کالج کی روانی میں حصہ ڈالا۔ نئے متعارف شدہ کورسز میں 51-1950ء میں بنگالی اور عربی میں آنرز کلاسز کا آغاز قابل ذکر ہے۔ اسی سال تک، B.A. پاس سطح پر تدریس کیے جانے والے مضامین درج ذیل تھے: (۲۲)

انگریزی، بنگالی، اردو، متبادل انگریزی، متبادل بنگالی، متبادل اردو، سنسکرت، عربی، فارسی، تاریخ، فلسفہ، معاشیات، ریاضی اور جغرافیہ۔

انٹرمیڈیٹ آرٹس اور سائنس کی سطح پر مضامین یہ تھے:

انگریزی، بنگالی، اردو، متبادل انگریزی، متبادل بنگالی، متبادل اردو، سنسکرت، عربی، فارسی، تاریخ، منطق، شہریات، تجارتی جغرافیہ، ریاضی، فزکس، کیمسٹری، نباتیات، حیاتیات اور جغرافیہ۔

جولائی 1958ء میں B.Sc. پاس کورسز کا آغاز فزکس، کیمسٹری اور ریاضی میں کیا گیا—یہ کالج میں سائنس کورسز کے تعارف کی طویل مدت سے ضروریات کو کم از کم جزوی طور پر پورا کرتا ہے۔ اسی وقت جغرافیہ میں B.Sc. آنرز کورس بھی متعارف ہوا۔

دستیاب ریکارڈ کے مطابق 58-1957ء میں پالی کو انٹرمیڈیٹ سطح پر ایک مضمون کے طور پر متعارف کرایا گیا جو بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔

B.Sc. سطح پر آنرز کورسز 61-1960ء سیشن میں ریاضی اور نباتیات میں شروع کئے گئے۔ اسی سیشن میں نئے تین سالہ ڈگری کورس کے تحت B.Sc. آنرز اور پاس کورسز کے لئے فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور نباتیات میں الحاق دیا گیا اور B.Sc. پاس کورس صرف حیوانیات میں شروع ہوا۔ موجودہ ہیومینٹیز میں الحاق برقرار رکھا گیا اور سیاسیات میں آنرز سطح تک تازہ الحاق حاصل کیا گیا، ساتھ ہی مختلف سطحوں پر ہندی کی تعلیم کے لیے بھی الحاق حاصل کیا گیا۔ اسی سیشن میں آرٹس اور سائنس میں ایک سالہ پری یونیورسٹی کورس بھی متعارف کرایا گیا۔

آنرز کلاسز جولائی 1961ء میں شروع کی گئیں اور فزکس میں آنرز کلاسز جولائی 1963ء میں متعارف کروائی گئیں۔ جولائی 1974ء میں زولوجی میں آنرز کورسز شروع ہوئے اور جولائی 1988ء میں سوشیالوجی کو گریجویشن سطح پر پاس سبجیکٹ کے طور پر شامل کیا گیا۔ 1976ء میں آرٹس اور سائنس میں دو سالہ ہائر سیکنڈری کورس ایک سالہ پری یونیورسٹی کورس کی جگہ لے گیا۔ اس سطح پر تدریس کیے جانے والے مضامین درج ذیل ہیں:

آرٹس اسٹریم: انگریزی (کمپلسری اور آلٹرنیٹیو)، بنگالی، اردو، ہندی، فارسی، عربی،

سنسکرت، ریاضی، تاریخ، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، جغرافیہ اور اکنامک جغرافیہ۔

سائنس اسٹریم: انگریزی (کمپلسری اور آلٹرنیٹیو)، بنگالی، اردو، ہندی، کیمسٹری، فزکس، ریاضی اور بایولوجیکل سائنس۔ چند سالوں میں کالج کے نصاب میں کئی دیگر مضامین، جیسے کمپیوٹر سائنس، اسٹیٹسٹکس اور مائیکرو بایولوجی شامل کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ کالج کے ریکارڈز بعض اوقات فزیالوجی اور انتھروپولوجی کو آنرز مضامین کے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ ٹیوٹوریل کلاسز، سیمینارز اور ہفتہ وار ٹیسٹس ہمیشہ کالج کے کام کے شیڈول کا باقاعدہ حصہ رہی ہیں۔

گزشتہ پچاسی سالوں کے دوران، کالج مسلسل توسیع پذیر رہا تاہم جگہ کی کمی کا مسئلہ ہمیشہ برقرار رہا جو آج بھی کافی شدید ہے۔ اس دوران کچھ نئی عمارات بھی تعمیر کی گئیں تاکہ اس مسئلے کو کم از کم جزوی طور پر حل کیا جاسکے۔ ابتدا میں دو منزلہ کالج کی عمارت بعد میں تیسری منزل حاصل کرگئی۔ سائنس شعبہ جات کے اضافی قیام کے لئے شاندار سائنس بلاک تعمیر کیا گیا۔ کوششیں کی گئی ہیں کہ سائنس شعبہ جات کو جدید لیبارٹریز فراہم کی جائیں، حالانکہ بہتری کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ کالج کی عمارت میں طلبہ کے لئے کامن روم بھی موجود ہے جس میں کچھ انڈور گیمز کے انتظامات اور رسائل وغیرہ فراہم کیے گئے ہیں۔ طالبات کے لئے کھیلوں کی مزید سہولیات فراہم کی گئی ہیں اور فزیکل انسٹرکٹریسز اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں ہوشیار ہیں۔ بہت سی مشکلات، جگہ اور عملے کی کمی کے باوجود، کالج کی لائبریری ان سالوں میں تیزی سے ترقی کرتی رہی۔ اگست 1959ء تک، لائبریری میں کتابوں کی تعداد 21,325 تک پہنچ گئی۔ موجودہ وقت میں لائبریری میں تقریباً 91,000 انٹریز موجود ہیں۔ لائبریری کا انتظام ایک لائبریرین کے ہاتھ میں ہے جس کی معاونت دو اسسٹنٹ لائبریرین کرتے ہیں اور چار ڈی گروپ کے لوگ بھی لائبریری کے مؤثر کام کو یقینی بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ کالج کا دفتر جو اس وقت آٹھ محنتی اور مخلص افراد کے زیر انتظام ہے، پوری تنظیم کا ایک اہم حصہ رہا ہے جو کالج کے انتظامی پہلوؤں کا خیال رکھتا ہے۔

جولائی 1950ء میں، ڈاکٹر روما چودھری، M.A,D.Phil(Oxford) جو طویل عرصے تک کالج کے فلسفہ کے شعبہ کی پروفیسر اور سربراہ رہی ہیں انھوں نے کالج کے پرنسپل کے طور پر ذمہ داری سنبھالی اور دسمبر 1968ء تک اس عہدے پر رہیں۔ ان کے بعد سجاتا چودھری (M.A) نے جو طویل عرصے تک انگریزی کے شعبہ کی پروفیسر اور سربراہ رہی تھیں، دسمبر 1968ء میں ذمہ داری سنبھالیں اور دسمبر 1971ء میں چھوڑ دیں۔ اگلی پرنسپل ڈاکٹر گوری ناگ M.A,D.Phil (London) تھیں جو طویل عرصے تک کالج کے اکنامکس کے شعبہ کی پروفیسر اور سربراہ رہیں اور دسمبر 1971ء سے مئی 1987ء تک اس عہدے پر فائز رہیں۔ مئی 1987ء میں ڈاکٹر مایا دت، M.A,D.Phil (London) جو جغرافیہ کے شعبہ کی پروفیسر اور سربراہ تھیں، نے کالج کے پرنسپل کے طور پر ذمہ داری سنبھالیں۔ بعد میں محترمہ کونیکا باسو (انچارج)، محترمہ ممتا رائے، محترمہ ممتا سنگھومترا، محترمہ میرا سرکار وغیرہ پرنسپل کے عہدے پر متمکن رہیں۔ فی الحال محترمہ سیولی سرکار اس کالج کی بہت ہی فعال پرنسپل کے طور پر اپنے فرائض منصبی انجام دے رہی ہیں۔ کالج اپنی ترقی کے لئے ان سب کی انتھک کوششوں کا مقروض ہے۔ اس کی گورننگ باڈی ادارے کے مؤثر انتظام کی نگرانی کرنے والی اعلیٰ ترین باڈی کے طور پر موجود ہے۔ ان تمام سالوں میں طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کی بھرپور ترقی کے لئے، کالج نے ان کی غیر نصابی سرگرمیوں کے مواقع بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ تعلیمی فلم شو، نمائشیں، تقریری مقابلے، مباحثے اور سیٹ تقریری مقابلے کالج کی زندگی کا باقاعدہ حصہ رہے ہیں۔ کالج کے اہم سالانہ پروگراموں میں فاؤنڈیشن ڈے اور پیرنٹس ڈے شامل ہیں اور ان مواقع پر طلبہ کی ڈرامائی اور موسیقی کی پرفارمنس ہر سال اعلیٰ معیار کی رہی ہے۔ دیگر کالج پروگراموں میں یوم آزادی، جمہوریہ دن، وان مہوتسو، کالج کے سالانہ کھیل وغیرہ شامل ہیں۔ اس دوران 1950ء سے، کالج کا میگزین بھی شائع ہونا شروع ہوا جو ہر سال شائع ہوتا رہا، البتہ کچھ سالوں میں اس میں وقفے آئے۔

اخیر میں لیڈی برابورن کالج کی تاریخ اس بات کا مظہر ہے کہ تعلیم کسی حد تک معاشرے کی تشکیل وتبدیلی کی قوت رکھتی ہے۔ 1939ء میں کالج ہونے والا یہ کالج اس وقت کی نمائندگی کرتا تھا جب بنگال میں مسلم خواتین شدید تعلیمی محرومیوں اور پستیوں کا سامنا کررہی تھیں۔ کالج کو اس انداز میں تصور کیا گیا کہ یہ روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک پل بن سکے اور ایک ایسا ماحول فراہم کرے جہاں خواتین کو ثقافتی لحاظ سے حساس تعلیم تک رسائی حاصل ہو۔ دہائیوں کے دوران، اس نے نہ صرف اپنے ابتدائی مشن کو پورا کیا بلکہ اسے عبور کرتے ہوئے ایک سیکولر اور علمی برتری کا حامل ادارہ بن گیا۔ ابتدائی چند طالبات کے ساتھ شروع ہونے کے باوجود، کالج نے مستقل ترقی کی اور تعلیمی وفکری دائرہ میں بھی وسعت پائی۔ اس نے تاریخی اور پیچیدہ حالات کا سامنا کیا، استعماری تعلیمی پالیسیوں سے لے کر آزادی کے دور کے اتار چڑھاؤ اور ایک نو آبادیاتی جمہوری ملک کی خواتین کو بااختیار بنانے کی خواہشات، جنگ، تقسیم اور فرقہ وارانہ تنازعات کے باوجود اس کی مضبوط تعلیم کے لئے ایک متحد اور آزاد کرنے والی قوت کے طور پر اس کی عمیق وابستگی کو ظاہر کرتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ لیڈی برابورن کالج نے محض رسمی تعلیم فراہم نہیں کی بلکہ اپنے کلبز، ہوسٹل کی زندگی، غیر نصابی سرگرمیوں اور مضبوط کمیونٹی کے اصولوں کے ذریعے ایک متحرک علمی وثقافتی ماحول کو فروغ دیا۔ اس کی فیکلٹی، منتظمین اور طالبات نے شاندار تعلیمی نتائج اور ممتاز فارغ التحصیل طالبات کی بہترین میراث قائم کی، جنھوں نے بعد میں معاشرے میں معنی خیز خدمات انجام دیں۔ آج یہ کالج اپنے قیام کے چھیاسیویں سال سے گزر رہا ہے، یعنی پندرہ سال بعد یہ 'جشن صدی' منائے گا جس کی منتظر ہماری اور آپ کی آنکھیں رہیں گی۔

فضل الحق کی دیگر تعلیمی وقومی خدمات

ابوالقاسم فضل الحق کو بنگالی مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور ابتری کا زبردست احساس تھا، لہٰذا انھوں نے مسلم طلبا وطالبات کے لئے تعلیمی درس گاہوں کا جال بچھا دیا تھا تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ملک اور قوم کی خدمت کرسکیں۔ کلکتہ میں انھوں نے اسلامیہ کالج، لیڈی برابورن کالج، بیکر مدرسہ ہوسٹل اور کارمائیکل ہوسٹل کے علاوہ دیگر چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں انھوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کئے ان میں راجشاہی میں آدینہ فضل الحق کالج، ڈھاکہ یونیورسٹی فضل الحق ہال، ایگریکلچرل یونیورسٹی شیر بنگلہ ہال، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، چکھر گورنمنٹ کالج، بلبل میوزک اکیڈمی اور سنٹرل ویمنس کالج اہم ہیں۔ وزیر اعظم رہتے ہوئے انھوں نے بنگلہ اکیڈمی کی بنیاد بھی ڈال دی تھی۔ انھوں نے ہی پہلا بیسا کھ کو عام چھٹی کا دن قرار دیا۔ فضل الحق کی وفات کے بعد ان کے نام سے منسوب کرکے متعدد تعلیمی ادارے قائم کئے، جن میں بریسال شیر بنگال میڈیکل کالج، شیر بنگال اسٹیڈیم، شیر بنگال میر پور اسٹیڈیم وغیرہ بھی قائم کئے گئے۔ علاوہ ازیں ان کی یاد میں کئی سڑکیں اور کئی عمارتیں بھی قائم کی گئیں۔ کلکتہ میں اے۔ کے فضل الحق ہائر سکنڈری اسکول ان کی یاد کو تازہ کررہا ہے۔

❑❑❑

ایم اے کنول جعفری
۲/ ۱۲۷ جامع مسجد، نینڈڑو تحصیل دھام پور، ضلع بجنور
9917767622

رُومانی دنیائے اَدب کا قائد: سجاد حیدر یلدرم

افسانہ اَدب کی نثری صنف ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے افسانہ فرضی کہانی کو کہا جاتا ہے،لیکن اَدب کی اصطلاح میں یہ لوک کہانی کی ہی ایک قسم ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول کا تعلق زندگی کے تمام تر نشیب و فراز سے ہے، جب کہ افسانہ زندگی کے صرف ایک جز یا حصے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ناول کی کہانی کسی قدر طویل ہوتی ہے، جب کہ افسانہ میں کہانی کی ساخت کافی مختصر اور قلیل ہوتی ہے۔ فیروز الغات اور ریختہ میں افسانہ کے معنی قصہ، کہانی، داستان، سرگزشت، روداد، حال احوال، ذکر، مذکور، چرچا، طولانی، فرضی، بے اصل، جھوٹی اور من گھڑنت بات کے ہیں۔ جدید اَدب کے تعلق سے ریختہ میں ناول کے مقابلے ایک مختصر کہانی جس میں زندگی کا کوئی خاص رُخ مختصر طور پر پیش کیا جائے، کا اضافہ بھی ہے۔ افسانہ بغیر 'الف' کے فسانہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے فسانۂ آرزو، فسانۂ دلفریب اور فسانۂ آدم وغیرہ۔ افسانہ کو کہانی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اَدبی تناظر میں افسانہ سے مراد مختصر افسانہ ہے، جو کم سے کم آدھے گھنٹے یا ایک نشست میں آسانی کے ساتھ پڑھ لیا جاتا ہے۔ افسانے میں کسی ایک واقعہ یا زندگی کے کسی اہم پہلو کو اختصار کے ساتھ دلچسپ انداز میں تحریر کیا جاتا ہے۔ اس میں اجزائے ترکیبی کا بڑا دخل ہے۔ افسانہ دیگر کہانیوں سے اس لیے بھی منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور تصویر کشی ہوتی ہے۔ افسانے کا انحصار 'ایک' پر ہوتا ہے۔ ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک مقصد اور ایک جذبہ وغیرہ۔ افسانے میں وحدت تاثر اور کلیت کا ہونا ضروری ہے۔

اُردو اَدب کی اصناف میں افسانہ کا اہم مقام ہے۔ یہ بیسویں صدی کی دین ہے۔ اُردو افسانے کی روایت کا باقاعدہ آغاز منشی پریم چند کی کہانیوں سے ہوا۔ افسانے کے ابتدائی دور میں دو قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ پہلا رجحان حقیقت پسندی کا ہے۔ اس کے روحِ رواں کے طور پر منشی پریم چند کو فضیلت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کا جوہر دکھاتے ہوئے نہ صرف افسانوی اَدب کا رُخ تبدیل کیا، بلکہ پسماندہ طبقات اور سماجی جبر و تشدد کے شکار عام لوگوں کی زندگی کے مسائل اور پریشانیوں کو بھی اپنے افسانوں کا اہم موضوع بنایا۔ پریم چند کی بدولت ہی ہمیں بھوک مٹانے کے لیے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے اور پیاس بجھانے کے لیے پانی کے ایک ایک گھونٹ کے لیے ترسنے والے دلت ذات کے افراد کی کسم پرسی کے ساتھ سماج کے ٹھیکیداروں، زمینداروں اور زرداروں کی تنگ ذہنیت کے دیدار ہو سکے۔ دوسرا رجحان رومانیت کا ہے۔ اُردو اَدب میں رومانی افسانے کی روایت کو فروغ دینے والوں میں سجاد حیدر یلدرم کا نام سب سے اُوپر رکھا جاتا ہے۔ دیگر افسانہ نگاروں میں احمد اکبر آبادی، سلطان حیدر جوش، مجنوں گورکھپوری اور بیگم حجاب امتیاز علی کے نام خاص طور پر ذکر کیے جاتے ہیں۔ جب کہ حقیقت پسندی میں پریم چند کی روایت کو فروغ دینے والوں میں پنڈت سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی اور اُپندر ناتھ اشک کے نام شمار کیے جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی شروعات 1936 میں ہوئی۔ اس دور کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قاضی عبدالستار اور رتن سنگھ وغیرہ کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ اس دور کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں نئے افسانے کی بنیاد رکھی گئی، جس کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں حسن عسکری، ممتاز شیریں، انتظار حسین اور سجاد حیدر یلدرم کی دختر قرۃ العین حیدر وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

''سجاد حیدر یلدرم نے مضمون نگار، انشائیہ نگار، مختصر افسانہ نگار، ترجمہ نگار، ناول نگار، شاعر، سیاح اور غیر ملکی زبانوں کے ماہر لسانیات سمیت اُردو اَدب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی اور اُردو اَدب کے ذخیرے میں خوب اضافہ کیا۔ انھیں اُردو افسانہ کے روحِ رواں اور رومانی دنیائے اَدب کے قائد کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ رومانیت کے بنیادی اصولوں میں تخیل کی فراوانی، ماضی پرستی، روایت سے بغاوت، جوش و جذبہ اور محبت شامل ہیں، لیکن سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت کا جو تصور ہے، وہ اُن سب سے جدا اور دوسرے رومان نگار افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔ ان کے دور یا بعد کے کئی مشہور و معروف افسانہ نگاروں نے ان کے ذریعہ تیار کی گئی پگڈنڈی پر چل کر آگے کی راہ ہموار کی اور اپنے تخیلات و تجربات کی بنا پر افسانوی اَدب کی دنیا میں شہرت کے آسمان تک رسائی حاصل کی۔''

اُردو اَدب کی تاریخ میں سجاد حیدر یلدرم ایسے پہلے اَدیب تسلیم کئے جاتے ہیں، جن کے قلم کی نوک سے قرطاس ابیض پر تحریر کی گئی کہانی نما عبارتیں اُردو میں افسانے لکھنے کی بنیاد بنیں۔ ان کے انداز فکر، انداز تحریر اور رومانی انداز نے آنے والے اَدیبوں کی کئی نسلوں کو خاصہ متاثر کیا۔ دبستان یلدرم کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل اور حوالے سے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ نثر کی تین اصناف پر مشتمل ان کی کتاب 'خیالستان' میں انشائیے اور انشائے لطیف (اَدب لطیف) کے علاوہ مختصر افسانے بھی شامل ہیں۔ کچھ ترکی اَدب سے ماخوذ اور ترجمہ ہیں، تو بعض طبع زاد ہیں۔ اِن اَدب پاروں میں پایا جانے والا سجاد حیدر یلدرم کا رومانی انداز قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر اُنھیں رومانیت کے بنیادی اصولوں سے توروشناس کراتا ہی ہے، اُنھیں آگے بڑھنے اور پڑھنے کے لیے بھی مجبور کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت کا جو تصور دکھائی دیتا ہے، اُس کی حیثیت الگ اور دوسرے اَدیبوں سے خاصی مختلف ہے۔ دوسرے اُدبا کے یہاں رومان کے لیے اُکسانے اور اُبھارنے کا محرک ہیجان و اضطراب پایا جاتا ہے، جب کہ سجاد حیدر یلدرم کے یہاں رومان کی کیفیت کافی حد تک سکون بخش اور اطمینان کی سی ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت کا جذبہ اور رومانیت کا عکس موجود ہے۔ ان کے یہاں عشق و محبت کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے رومانی پس منظر کو لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے صنف نازک کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جذبات کی تصویر کشی میں ماہر سجاد حیدر یلدرم کے رومان کا دارومدار عورت ذات پر منحصر ہے۔ وہ سماج کے تانے بانے میں خاتون کو محبت سے الگ کر کے نہیں دیکھتے، بلکہ اُسے محبت کا ایک حسین محور تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں معشوق کا حسن و جمال اور طرح داری کسی سے چھپی نہیں ہے۔ اُن کی تحریر اور کہانی کا اہم کردار ایک ایسا سچا عاشق ہے، جو ضرورت پڑنے پر مرد و زن کو ایک پنچ کی زینت بنا دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بطور مشاطہ وہ معشوق کے سر میں کنگھی و چوٹی کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اُسے ایک دُلہن کی طرح سجانے سنوارنے اور نگھار کر کے خوبصورت بنانے کے کام کو بھی بہ حسن و خوبی انجام دیتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کے لب و لہجہ میں کہیں کہیں انگریزی اور کہیں کہیں ترکی زبان کی برتری نظر آتی ہے، لیکن اس سے کہیں بھی غیر مانوسی اور ناخوش گواری کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے سجاد حیدر یلدرم کی کتاب 'خیالستان' کے دیباچہ میں نیر نگ لکھتے ہیں۔

> ''ان کوششوں میں سجاد حیدر یلدرم بھی شریک ہوئے ہیں۔ شاہد رعنائے سخن کے شیداؤں میں وہ کسی سے پیچھے نہیں، آگے ہی ہیں۔ لیکن وہ عاشق بھی ہیں اور مشاطہ بھی۔ وہ 'اسباب حسن یار' کے بڑھانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اس کا جواب ان حضرات سے پوچھئے، جو اہل نظر اور صاحب طبیعت ہیں۔ اُن کے انداز بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے اور کہیں کہیں غالباً ترکی طرز بیان کا چربہ ہے، مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور ترکی کی یہ تقلید عملی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے۔ کیوں کہ وہ غیر مانوس اور ناخوش گوار نہیں ہونے پاتی۔ اس میں انوکھا پن ہوتا ہے، مگر اجنبیت نہیں ہوتی۔'' 1

(1- دیباچہ از نیر نگ، 'خیالستان': سجاد حیدر یلدرم صفحہ نمبر 11)

سجاد حیدر یلدرم 1880 میں اتر پردیش صوبے کے ضلع بجنور کے قصبہ نہٹور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید جلال الدین بنارس میں سرکاری ملازم تھے۔ اس لیے سجاد حیدر یلدرم کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1893 میں سر سید احمد خاں کے اسکول مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ 1901 میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ بی اے کرنے کے بعد سجاد حیدر یلدرم ناگپور چلے گئے اور وہاں کے حکمران اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد حکومت نے انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوبارہ علی گڑھ بھیج دیا۔ انھیں ترکی زبان و اَدب سے خاصی دلچسپی ہوگئی۔ ترکی کے افسانوں نے انھیں خاص طور سے متاثر کیا۔ عراق میں بغداد کے برطانوی قونصل خانہ میں ترکی زبان کے ترجمان کی ضرورت تھی۔ اس لیے سجاد حیدر یلدرم نوکری کی غرض سے وہاں چلے گئے۔ ترکی میں انھیں ترکی اَدبیات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بہت سی ترکی کہانیوں کا اُردو میں ترجمہ کر اُردو نثر میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد بغداد سے قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے کے لیے منتقل کر دئے گئے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل کابل کے امیر کے نائب سیاسی ایجنٹ کے طور پر ہندوستان لوٹ آئے۔ کچھ عرصے ملازمت کرنے کے بعد 1920 میں علی گڑھ یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے اور ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں سجاد حیدر یلدرم نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ 12 اپریل 1943 کو لکھنؤ میں ان کی وفات ہوئی اور وہیں عیش باغ میں دفن کئے گئے۔ ان کی تصنیف و تالیف میں خیالستان، آسیب اُلفت، حکایت و احساسات، حکایت لیلیٰ و مجنوں، جنگ و جدال، پرانا خواب اور دو افسانے، زہرا، جلال الدین خوارزم، ہما خانم اور ثالث بالخیر یا لڑکی کی کارستانی وغیرہ شامل ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم نے مضمون نگار، انشائیہ نگار، مختصر افسانہ نگار، ترجمہ نگار، ناول نگار، شاعر، سیاح اور غیر ملکی زبانوں کے ماہر لسانیات سمیت اُردو اَدب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی اور اُردو ادب کے ذخیرے میں خوب اضافہ کیا۔ انھیں اُردو افسانہ کے روح رواں اور رومانی دبستانِ اَدب کے قائد کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ رومانیت کے بنیادی اصولوں میں تخیل کی فراوانی، ماضی پرستی، روایت سے بغاوت، جوش و جذبہ اور محبت شامل ہیں، لیکن سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت کا جو تصور ہے، وہ اُن سب سے جدا اور دوسرے رومان نگار افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔ ان کے دور یا بعد کے کئی مشہور و معروف افسانہ نگاروں نے ان کے ذریعہ تیار کی گئی پگڈنڈی پر چل کر آگے کی راہ ہموار کی اور اپنے تخیلات و تجربات کی بنا پر افسانوی اَدب کی دنیا میں شہرت کے آسمان تک رسائی حاصل کی۔ فن اور اسلوب کے لحاظ سے رومانی طرز و فکر کی نمائندگی کرنے والے ان کے افسانے، افسانوی اَدب کے فروغ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے عورت اور محبت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ رومانی افسانہ نگاروں نے افسانوں کو مقبول عام بنانے کی خدمات کو انجام دیتے ہوئے اپنے تخیلات سے محبت کے جذبے کو کچھ ایسے حسین اور رنگین انداز میں پیش کیا کہ نئی نسل کے قاری افسانوں کے کرداروں سے متاثر ہو کر ان میں دلچسپی لیے بغیر نہیں رہ سکے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں میں منظر نگاری، مکالمہ نویسی اور وحدت تاثر جیسے عناصر اور فنی خصوصیات پر خصوصی توجہ دی۔

> 'عورت آئینہ دیکھ رہی تھی اور اپنے حسن پر ناقدانہ نگاہ ڈال کر اور اپنے حسن کو بے عیب پا کر خود ہی لطف اٹھا رہی تھی۔ اور ہنس ہنس کر مرد سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ہنستے وقت اس کے دانتوں کا چمکنا باتیں کرتے وقت اُس کی آنکھوں میں نور کا پیدا ہونا اُس کے بالوں کے جواہرات اُس کے جسم کو لپیٹے ہوئے ریشمی کپڑوں کی خوبصورتی اُسے ایک ملکۂ حسن بنائے ہوئے تھی۔ اپنے نازک و موزوں

بازوؤں کو مرد کے زانوں پر رکھے ہوئے تھی، جو ایک تکیئے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اپنے حسین اور لمبے قد کو پیچھے کی طرف ڈالے ہوئے وہ اُس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت بلی کے بچے کی طرح شوخ تھی۔ مرد عاشقانہ نظروں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی تمام رُوح، اپنے تمام عشق، اپنی تمام حیرانی و پرستش سے اُس کی شوخیوں سے لطف اُٹھا رہا تھا۔' 2

(2- آسیب اُلفت: از سید سجاد حیدر یلدرم، 1930 صفحہ نمبر 67)

سجاد حیدر یلدرم منظر نگاری کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ اُن کے ذہن میں بسے مصور کو صرف عورت ذات کا سراپا ہی دکھائی نہیں دیتا تھا، وہ مرد ذات کا نقشہ بھی اسی ترتیب سے اُتارنے میں ماہر تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھولتے تصویر کش کے چہرے کا دایاں حصہ بادصبا کی خوش گواری اور لطافت سے محظوظ ہوتا تھا، تو ریگستان اور بنجر خطے سے گزر کر آنے والی بادسموم چہرے کے بائیں حصے کو ناخوش گواری اور بے لطفی کا احساس کرانے کی مہارت بھی رکھتا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم مرد و زن اور چرند و پرند کی حرکات و سکنات کے علاوہ ایک سمت سے دوسری سمت بہنے والی ہوا کے خنک مزاج کو جس طرح پڑھ لیتے تھے، ٹھیک اُسی طرح بے جان چیزوں اور ان کے حقیقی مقامات پر بھی عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ مختصر افسانوں اور مضامین کے اپنے دوسرے مجموعہ 'حکایات و احتساسات' کے 'آئینے کے سامنے' میں ایک کمرے کی بے ترتیبی اور جا بجا بکھرے پڑے سامان کی جھلک موجود ہے۔ اس بدنظمی کا سبب کوئی اور نہیں، بلکہ اولاد آدم اور اس کی جھنجھلاہٹ ہی ہے۔

'اب کھڑکی کے پردے کو ہلاتی ہوئی کوچ کی جھالر کو جنبش دیتی ہوئی بادصبا کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے لمبے لمبے سانس لے کر اپنے جگر کو بھرنا شروع کیا۔ اس صاف ہوا کے کھانے سے اُسے شگفتگی معلوم ہوئی اور اس کے اعصاب میں سکون آیا۔ تھوڑی دیر کھڑکی کے پاس اسی طرح ٹھہری، اس کے پلنگ کے پاس آ کر اُس نے اپنی جرابیں پہنیں۔ کمرہ ایسی گڑبڑ حالت میں تھا کہ اُس سے اُس کی طبیعت میں بہت اُلجھن پیدا ہوئی۔ کوچ کے پاس کل شام کی چائے کی چھوٹی میز مع چائے کے سامان کے رکھی ہوئی تھی، جس کے اُٹھانے کا وقت نہ ملا تھا۔ پیالیاں میلی تھیں، پلیٹوں میں کچھ بسکٹ، کچھ میوہ، کچھ کھایا کچھ بکھرا پڑا تھا۔ کوچ پر کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ کچھ اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔ الماریوں میں کتابوں کی خالی جگہ اُنھیں زبانِ حال سے بلا رہی تھیں۔ اخبارات و رسالے ترتیب کے طالب تھے۔ جنھیں اس کے خاوند نے جھنجھلاہٹ میں پڑھا تھا اور کسی رسالے کے ورق انگلی ہی سے اس طرح بے پروائی سے کاٹے تھے کہ صفحوں کے متن کٹ گئے تھے۔ جلی ہوئی دیا سلائیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں، سگریٹ کی خالی ڈبیاں لڑک رہی تھیں۔ اِدھر ایک واسکٹ پڑی تھی، تو اِدھر خاوند کے شب خوابی کے کپڑے پڑے تھے۔ کرسیاں اپنی جگہ سے ہٹی پڑی تھیں۔ ایک کالر فرش پر گرا پڑا تھا، میز پر تولیا بنڈل بنی ہوئی پڑی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں نے اِدھر اُدھر پڑ کر کمرے کو عجیب غیر منظم حالت میں ڈال رکھا تھا۔' 3

(3- حکایات و احتساسات: آئینے کے سامنے، از سجاد حیدر یلدرم، 1345 ہجری، صفحہ نمبر 12)

اُردو اَدب کو نئی جہتیں عطا کرنے والے رومان پسند سجاد حیدر یلدرم کی افسانہ نگاری میں فکری و تہذیبی عناصر کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات، سماجی مسائل اور روحانیت کو الگ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ صرف قصوں اور کہانیوں تک ہی محدود نہیں رہے، بلکہ قارئین کو غور و فکر کے لیے بھی مجبور کرتے ہیں۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا، عام لوگوں کو درپیش مسائل کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور پھر انھیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانوں کی زینت بنایا۔ ان کے افسانوں میں عشق، رومانیت، روحانیت اور مشرقی اقدار کی موجودگی پائی جاتی ہیں، تو مغربی معاشرت کے اثرات بھی ان کے موضوعات میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انسانی جذبات، رُوحانی احساسات، فکر و خیال، فلسفیانہ افکار، عام زندگی کی سچائیاں اور فکری پیچیدگیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں رُومانی اور جذباتی عناصر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کے علاوہ نفسیاتی اور علامتی پہلوؤں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کے زیادہ تر کردار اندرونی کشمکش کا شکار ہیں۔ کہانیوں کی زبان عام فہم، صاف، سادہ، لطیف ہونے کے ساتھ معنویت لیے ہوئے ہے، جو قارئین کے قلوب پر سیدھا اثر کرتے ہوئے انھیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ وہ ایک عام عورت کے جذبات اور اس کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کا عکس ان کے افسانوں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ انسان کے اندر پائی جانے والی خواہشات اور تضادات کا اظہار بھی کافی نمایاں ہے۔ ان کی کہانیوں میں انسانی زندگی کے تانے بانے اور مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کی نثر میں یہ بات واضح طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ جذبات کی روانی میں اَدبی وقار کو بے قابو ہو کر بہنے نہیں دیتے۔ ان کے یہاں جذبات کے ہیجان اور شدت میں تیزی نہیں ملتی۔ اگر کہیں اس قسم کی صورت حال پیدا ہوتی، تو ان کی معمولی کوشش اس کو معتدل کر لیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبے کی متانت و عفت کو متوازن بنائے رکھا۔ ان کی تحریروں میں مشرقی تہذیب و تمدن سے دلچسپی اور زبان کی لطافت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اَدب میں رومانی انداز تحریر کی روایت موجود نہیں ہونے کے باوجود رومانی اسلوب تحریر اختیار کیا اور اُردو نثر کو نئے کیف سے روشناس کرایا۔ ان کے نئے ترنم اور نئے آہنگ نے خوابیدہ جملوں کو بیدار کر مجہولی کیفیت کو دُور کیا۔ انھوں نے مرکبات بنانے کا شعور ترکی زبان سے حاصل کیا اور عربی و فارسی کے الفاظ سے خوب استفادہ کیا۔ ان کے یہاں ہلکا مزاح، لطیف طنز، خوش گوار تنقید اور بے بار اصلاح پائی جاتی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اُردو اَدب کے اُن چند اَدیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں، جنھوں نے شاعری کی طرح اُردو نثر کو ایک نیا شعور اور نیا رنگ عطا کیا۔ انھوں نے رُومانی فضا قائم کی اور جمالیاتی احساس اور ادب لطیف کے ذریعہ اُردو نثر کو نئی وسعت بخشی۔ انھوں نے اُردو نثر کو صرف اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ اسے حسن بیان اور دلکشی کا پیکر بھی بنایا۔ ان کی نثر میں الفاظ کی شیرینی، جملوں کی روانی، اور خیالات کی نزاکت پائی جاتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کو اُردو نثر کو واقعاتی سطح سے اُوپر اُٹھا کر تخیلات و جمالیات کی فضا میں داخل کرنے اور اُردو افسانے و انشائیے کو نئی جہت دینے کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

❑❑❑

سوریہ پرکاش راؤ

اسٹنٹ پروفیسر شعبہء اردو، بریلی کالج، بریلی

6392140207

ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سیاست اور پیغام

تحریک آزادی کے معمار مولانہ ابولکلام آزاد کی شخصیت اپنے آپ میں بے نظیر و بے مثال ہے۔ان کی قد آور شخصیت ہر پہلو سے ممتاز نظر آتی ہے۔جو اردو ادب کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔موصوف جہاں ایک سیاست داں، مفکر قوم، صحافی، مفسر قرآن، انشا پرداز، مجاہد آزادی اور ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم رہے وہیں ایک مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی مسلم نظر آتے ہیں۔مثلاً آزاد کی شخصیت ہمہ جہت صلاحیتو کی حامل ہے۔مولانا آزاد کی تصنیف کردہ کتاب 'خودنوشت'' کے دیباچہ میں نعیم احسن صاحب رقمطراز ہیں:

> ''مقلد ہر روز پیدا ہوتے ہیں لیکن قابل تقلید ہستیاں برسوں بلکہ صدیوں بعد جنم لیتی ہیں۔ ایسی ہی ایک قابل تقلید ہستی اور روشن دماغ قائد مولانا آزاد بھی تھے۔یہ روشن دماغ شخصیت نہیں بلکہ تاریخ کا ایک عہد اور عہد ساز ہستی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے سیاسی اختلاف رکھنے والے بھی علمی اور فکری حوالے سے ان کی قوہ قامتی کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔''

''خودنوشت'' از مولانا ابوالکلام آزاد ص۔۱۱

پانچ بھائی بہنوں میں آزاد سب سے چھوٹے تھے۔۱۱ نومبر 1888 میں آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور 22 فروری 1958 کو دہلی میں انتقال فرمایاء۔ان کا اصل نام غلام محی الدین تھا اور تاریخی نام فیروز بخت تھا۔لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد رکھتے تھے۔لیکن اردو ادب کی دنیا میں ابوالکلام آزاد ہی وہ نام ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ان کے بزرگوں کا اصل وطن دہلی تھا۔مگر ان کے والدین مولانا خیرالدین صاحب نے 1877 میں مستقل طور پر کلکتہ میں قیام پذیر ہوئے۔ان کے دادا شیخ محمد ہادی اور مولانا خیرالدین اور والدہ عالیہ بیگم نیک دل، مہذب اور پاک صفت انسان تھے۔مولانا صاحب کی شریک حیات زلیخا بیگم ایک نیک خواتین تھی۔جو ہر وقت مولانا آزاد کے پیرو تھی۔

''آزاد جب سولہ۔سترہ سال کے تھے اسی وقت سے ان دل میں حب الوطنی کے جذبات پیدہ ہونے لگے تھے۔سیاست کے ذریعے سے انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی بہترین صحافت نگاری (مثلاً ''الہلال'' اور ''البلاغ'' جو پوری طرح سے ان کی سیاسی نظریے کی تبلیغ کرتیں ہیں) کے علاوہ آزاد نے اپنی خطبات کے ذریعے عوام کے مردہ دلوں میں آزادی کے جوش و جنون پیدہ کیے۔خاص کر مسلمانوں کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جو علی گھڑھ تحریک سے وابستہ تھے۔ان سے انہوں نے ملک و قوم کی جنگ آزادی میں شامل ہونے کی اپیل (Appeal) کی۔بہ قول رفیع الدین صاحب:''آزاد ملک کی آزادی اور قومیت کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو بے حد ضروری تسلیم کرتے تھے۔''مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کے بانی تھے۔''

آزاد کا ذہن بہت تیز تھا۔ایک شخص کے اندر جو خوبیاں اور صلاحیتیں بہت بعد میں آتی ہیں، آزاد میں ان کے بچپن سے ہی موجود تھیں اور ہو بھی کیوں نہیں جن کے گھر کا ماحول پہلے سے ہی درس و تدریس سے لبریز ہو۔ان کے والد خود ایک ادیب، مذہب پرست انسان اور مولانا تھے۔ان کے بھائی ابوالنصر صاحب بھی ایک شاعر تھے۔جو 'آہ' تخلص اختیار کیے تھے۔ان کی بڑی بہن زینت بیگم، منجھلی فاطمی بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو یہ تینوں عالم و فاضل تھیں۔جن کا اثر آزاد پر پڑنا لازمی تھا کیونکہ وہ گھر میں سب سے چھوٹے تھے۔مگر سب سے ذہین تھے۔بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ مکمل صلاحیتیں اور خوبیاں ان کو ان کے ورثے میں ملی تھیں۔ابوالکلام آزاد گیارہ (11) سال کی عمر میں ایک ادبی پرچہ'' نیرنگ عالم'' (1899) جاری کیا(جو آٹھ ماہ چلنے کے بعد بند ہوگیا تھا)۔اس کے دو سال بعد تیرہ سال کی عمر میں ایک اور رسالہ'' المصباح'' (1900) جو چار مہینے تک چھپا، جاری کیا۔یہی نہیں بلکہ پندرہ سال کی عمر میں ماہبامہ''لسان الصدق''(نومبر 1903 کو جاری کیا تھا جو مئی 1905 میں بند ہوگیا)، ہفت روزہ ''الہلال'' (13 جولائی 1912 کو کلکتہ سے شائع کیا جو 18 نومبر 1914 کو بند ہوگیا)

اور" البلاغ" (12 نومبر 1915 کو جاری کیا اور اپنی غیر معمولی ذہانت کا لوہا منوایا۔

مولانا آزاد نے اپنی کم عمری میں جب تعلیمی سلسلہ شروع کیا تو ان کے والد صاحب چاہتے تھے کہ وہ صرف اور صرف درسیات اور مذہبی کتابوں کا ہی مطالعہ کریں اور ان پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھیں کیونکہ ان کے گھر کا ماحول پہلے سے ہی مذہبی تھا۔ پر آزاد نے اس قدیم روایت سے ذرا ہٹ کر مختلف راہ اختیار کیا۔ انہوں نے خود ہی تحریر کیا ہے کہ :

" والد مرحوم کو کچھ کچھ پتہ چلا کہ میں درسی کتابوں کے علاوہ اور کتابیں بھی دیکھا کرتا ہوں۔ تو وہ بہت سختی سے مانع ہوئے اور اس کی نگرانی کرنے لگے۔"

("خودنوشت" از مولانا ابوالکلام آزاد ص۔144)

گویا آزاد صرف درسیات اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کے لیے نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ وہ دیگر کتابوں کے مطالعہ کرنے اور لافانی کارنامہ انجام دینے کو پیدہ ہوئے تھے ۔جس طرح کسی کھیت یا کوہ سے نکلنے والا پانی خود بخود اپنا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور اپنے راستے میں آنے والی از سر نو پریشانیوں و تکلیفوں کا سامنا کرتے ہوئے رفتہ رفتہ وہ ندی کی شکل میں تبدیل ہو کر ایک سمندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہی صلاحیت اور خوبیاں مولانا آزاد میں خداداد موجود تھیں۔ بلا شبہ آزاد مطالعہء درسیات تک ہی محدود رہ جاتے تو نہ وہ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم ہوتے اور نہ ہی سیاست داں، مفکر قوم، صحافی، انشاء پرداز، مجاہد آزادی اور مکتوب نگار ہوتے۔ اور نہ ہی ان کے زرخیز قلم سے مذکورہ بالا ذکر اخبارات و رسالے اور" مکاتیب آزاد"،" کاروان خیال"،" تبرکات آزاد"،" ترجمان القرآن" اور" بارخاطر" جیسی لافانی تصنیفوں کا وجود عمل میں آتا۔

آزاد جب سولہ۔سترہ (16-17) سال کے تھے اسی وقت سے ان دل میں حب الوطنی کے جذبات پیدہ ہونے لگے تھے۔ سیاست کے ذریعے سے انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی بہترین صحافت نگاری (مثلاً" الہلال" اور " البلاغ" جو پوری طرح سے ان کی سیاسی نظریے کی تبلیغ کرتیں ہیں) کے علاوہ آزاد نے اپنی خطبات کے ذریعے عوام کے مردہ دلوں میں آزادی کے جوش و جنون پیدہ کیے۔ خاص کر مسلمانوں کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جو علی گھڑھ تحریک سے وابستہ تھے۔ ان سے انہوں نے ملک و قوم کی جنگ آزادی میں شامل ہونے کی اپیل (Appeal) کی۔ بہ قول رفیع الدین صاحب :

" آزاد ملک کی آزادی اور قومیت کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو بے حد ضروری تسلیم کرتے تھے۔" مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنے ملک و قوم سے محبت کے جذبات ہی لوگوں کے دلوں میں پیدا نہیں کیا ہے بلکہ انہیں باہمی ربط و ملت، اور اتحاد قائم کرنے کی صلاح بھی دیا ہے۔ ایک دوسرے کے مذہب سے محبت کرنا ہی ایک عالم انسانیت کی بہترین شناخت ہے۔ مولانا آزاد انسانیت کو ملک و قوم کی آزادی پر ترجیح دیتے ہیں :

" آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔"

مذکورہ بالا قول سے آزاد کے بلند خیالی، اعلی انسانیت کے جذبات و تصورات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہو سکا آزاد نے اپنی تحریروں کے ذریعے سے، تقریروں کے ذریعے سے، عوام کو بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کیا ہے۔ آزاد سرسید احمد خان کی مذہبی افکار اور سیاسی زندگی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے سر سید کے افکار و نظریات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ لوکمانیہ تلک، گاندھی جی، پنڈت نہرو، جیسے کانگریسی رہنماؤں کا جہاں ساتھ رہا اور ساتھ ہی شیام شنکر چکرورتی اور آر بندو گھوش جیسے انقلابیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

آزاد کی سیاسی شخصیت کو تین (3) پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے:

اول: ان کی سیاسی نظریے

۱۔ ملک کے بٹوارے کے خلاف تھے۔

۲۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔

۳۔ کانگریس کے حمایتی تھے۔ اور تنہا ایسے ایک شخص تھے جو تقسیم ملک کے خلاف تھے۔

۴۔ ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔

۵۔ اسلامی عوام کی غفلت پرستی دور کر کے انھیں جنگ آزادی میں شامل ہونے کی اپیل کرنا۔

۶۔ U.G.C. (UNIVERSITY GRANT COMMISSION) کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد کے نظریے کی تکمیل ہے۔

دوم: آزاد کی سیاسی زندگی

۱۔ آزاد کی سیاسی زندگی کے دن بہت اچھے نہیں تھے۔ انھیں مالی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ چار، پانچ مرتبہ قید و بند کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

۲۔ آزاد (I.N.C.) کے صدر بھی تھے۔ تقریباً ۹ سال تک۔ ان کے بعد نہرو کو کانگریس کا صدر بنایا گیا۔

۳۔" الہلال" بنگال حکومت نے ضبط کر لیا تو آزاد نے ایک " البلاغ" پریس قائم کیا اور " البلاغ" کے نام سے اخبار نکالا۔ آزاد کی یہ دل دلیری دیکھ کر حکومت بنگال نے" Deffence Of Indian Regulations" کے ایکٹ کے تحت انھیں بنگال سے باہر نکل جانے کا حکم صادر کیا۔

۴۔ آزاد رانچی میں تین سال (1916-1919) تک قید تھے۔ اسی دوران انھوں نے دو بہترین کتابیں تصنیف کی۔ ایک تو" ترجمان القرآن " اور دوسری" تذکرہ" کے نام سے اپنی خودنوشت لکھی۔

۵۔ جب قلعہ احمد نگر میں قید و بند کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے 1942 سے 1945 کے درمیان" غبار خاطر" لکھا۔ جسے اپنی رہائی کے بعد مئی 1946 میں شائع کیا۔

۶۔ قلعہ احمد نگر میں مقید تھے تبھی ان کی وفاء شعار بیوی زلیخا بیگم 9 اپریل 1943 کو انتقال فرما گئیں۔ جس کی خبر جیلر نے ان کو شام کو دی۔

۷۔ آزاد نینی جیل میں بھی قید تھے۔ (1941)

سوم: آزاد کی سیاسی خدمات

۱۔ آزاد نے" الہلال" اور " البلاغ " کے نام سے اخبار نکالا۔ جو پوری طرح سے ان کے سیاسی نظریے کی تبلیغ کرتیں ہیں۔

۲۔" تذکرہ" (1916)

۳۔" خطبات آزاد" (آزاد کے وہ خطبے ہیں جو مردہ دلوں میں روح پھونک دیتے ہیں۔

اتنی مشکلات کے باوجود بھی آزاد صبر و شکر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے

ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد کی کشادہ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے گاندھی جی لکھتے ہیں کہ :

" مجھے 1920 سے قومی کام میں مولانا آزاد کے ساتھ وابستہ رہنے کا فخر حاصل رہا۔اسلام کے بارے میں ان سے زیادہ معلومات کسی کو حاصل نہیں ہے۔عربی زبان کے وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ان کی دیش بھکتی اس طرح پختہ ہے جس طرح ان کا اسلام میں عقیدہ۔اور ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کرنے والے ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے مرتبہ خلیق انجم،ص۔44-43)

آزاد کے متعلق آچاریہ کرپلانی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" وہ تاریخی شخصیت نہیں تاریخ کا ایک عہد تھے۔"

آزاد کے یہاں نثر نگاری کے بھی بہترین نمونے ملتے ہیں۔جو سادگی وسلاست میر امنؔ کے یہاں ہے،اور جو مقفیٰ مسجع نثر رجب علی بیگ سرور کے یہاں ملتی ہے اس سے ذرا نکھری ہوئی شکل میں غالب،محمد حسین آزاد،حالی،شبلی،اور سرسید کے یہاں ملتی ہے۔ہر عہد کی نثر نگاری اپنی اہمیت کی حامل ہے۔وہی سادگی وسلاست اور روانی ورعنائی مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں بھی ملتی ہے۔جو ان کی تصنیف " غبارِ خاطر"،" ترجمان القرآن" اور ان کے رسالے " الہلال" و" البلاغ" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔آزاد کے خطوط کا مجموعہ " غبارِ خاطر" کے خط' داستان بے ستون وکوہ کن' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

" کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے۔اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلا تا رہے۔"

(" غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام،ص۔22)

ملک کی آزادی میں ہندو مسلم دونوں برابر کے شریک تھے۔اس لیے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس ملک پر جتنا حق غیر مسلمانوں کا ہے اتنا ہی حق مسلمانوں کا بھی ہے۔فرق ہے تو صرف آزاد اور آزاد کے خیالات اور ان کے تصورات کو سمجھنے کی،عمل کرنے کی۔کیونکہ آزاد پہلے ایسے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے ہندو مسلم اتحاد،اور اپنی سیاسی،مذہبی فکر کے ساتھ ملک کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے میں پہل کی بلکہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ضرورت ہے تو آج کے سیاست داں کو آزاد کے فکری تصورات سے فیضاب ہونے کی،سمجھنے کی۔ آزاد کے سیاسی فکری پہلوؤں پر غور کرکے ہی ملک میں امن وامان کا ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے ماضی تھے لیکن ان کی سیاسی،مذہبی اور قومی فکری تصورات وخیالات ہمارے مستقبل کی بنیادیں ہیں۔جس پر عمل کرکے ہی ہم خوش نماء ماحول اور مہذب ہندوستان کی تعمیر کرسکتے ہیں۔

کتابیات/حوالہ جات

۱۔مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے مرتبہ خلیق انجم۔اردو اکادمی دہلی۔2017

۲۔ایوان اردو کا مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔اردو اکادمی دہلی۔2014

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت،سیاست،پیغام) از رشید الدین خاں۔قومی کونسل: برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی۔2003

۴۔خود نوشت از مولانا ابوالکلام آزاد

۵۔ غبارِ خاطر مرتبہ مالک رام

❑❑❑

غزل

روٹھ جائے گی زندگانی بھی
ساتھ دے گی نہ یہ جوانی بھی

مشکلوں سے کبھی نہ گھبرانا
مشکلوں میں ہے کامرانی بھی

چھوڑ آئے ہیں جس کو ہم پیچھے
یاد آتی ہے وہ کہانی بھی

بات وہ بھی بتا دیا ان کو
بات انسے تھی جو چھپانی بھی

میں نے دیکھا ہے ظلم بھی تیرا
یاد آتی ہے مہربانی بھی

نام سے تیرے اپنے آنگن میں
اک لگائی ہے رات رانی بھی

میں نے سوچا نہیں تھا وہ اکرمؔ
بھول جائیں گے حق بیانی بھی

اقبال اکرم وارثی
شیخ سرائے لکھیم پوری کھیری
9335380992

ڈاکٹر سنتوش کمار جے ہند
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، ذاکر حسین کالج نئی دہلی
9717028565

بلونت سنگھ کی نگارشات میں دیہی مسائل

اردو ادب کے مشہور فکشن نگار بلونت سنگھ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ان کو اردو اور ہندی افسانوں و ناولوں میں مہارت حاصل تھی۔ان کی کہانیوں میں دیہی مسائل اور ان کے ناولوں میں کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کے مسائل ملتے ہیں۔ان کے تمام افسانوں م و ناولوں کا مطالعہ اور مشاہدہ اس انداز میں کرتے ہیں کہ دیہی زندگی کے تمام مسائل حقیقی رنگوں کے ساتھ ہمارے سامنے گھومنے لگتی ہے۔اردو ادب میں بلونت سنگھ کا مقام بہت بلند ہے۔

بلونت سنگھ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار زیادہ تر پنجاب کے دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا نام تقسیم ہند کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل پر لکھنے والوں میں بہت اہم ہے۔یہ پنجاب کے کسانوں، مزدوروں، عورتوں اور بچوں کے مسائل کو نہ صرف بے باکی سے اٹھاتے ہیں بلکہ ان کی حقیقت بیانی بھی کرتے ہیں۔

بلونت سنگھ کی پیدائش جون 1921ء میں ضلع چک بہلول گجرانوالہ (پاکستان) میں ہوئی تھی۔اسکول کی تعلیم حاصل کرتے وقت لکھنا شروع کر دیا تھا۔ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' اگست 1938ء ''ساقی'' میں شائع ہوا۔اس طرح 1938ء سے 1943 تک تمام افسانے منظر عام پر آتے رہیں۔اس کے بعد بھی ان کے بہت سے رسالوں میں ناول وغیرہ شائع ہوتے رہیں جن کی وجہ سے بلونت سنگھ آج اردو ادب میں بہت مشہور ہیں۔ان کی ہمہ گیر شخصیت دنیاوی ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔ان کا ایک افسانہ پہلی بار پاکستان لاہور میں شائع ہوا تھا وہ افسانہ ''شہناز'' ''ادبی دنیا'' لاہور پاکستان میں چھپا۔وہ بہت مشہور ہوا۔بلونت سنگھ سے متعلق جمیل اختر لکھتے ہیں۔

> ''بلونت سنگھ اپنے عہد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔جون 1921 میں چک بہلول ضلع گجرانوالہ (پاکستان) میں ولادت ہوئی۔بلونت سنگھ نے اسکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' ''ساقی'' اگست 1938 میں شائع ہوا۔''

(کلیات بلونت سنگھ، جلد اول، جمیل اختر، ص۔۹)

پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

> ''بلونت سنگھ جون ۱۹۲۱ء میں چک بہلول ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم وہیں گاؤں کے کریسنٹ پرائمری اسکول میں ہوئی۔ان کے والد سردار لال سنگھ دہرہ دون کے ملٹری کالج میں لکچرر تھے، کچھ برسوں کے بعد بلونت سنگھ ان کے پاس چلے گئے اور وہیں کیمبرج پرائمری اسکول دہرہ دون سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔بلونت سنگھ نے انٹرمیڈیٹ جمنا کرسچین کالج الہ آباد سے کیا، اور ۱۹۴۲ء میں بی اے کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔۔۔ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے لاہور سے شائع ہوئے۔تقسیم ہند سے پہلے ہی وہ اردو کے ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے نمایاں ہو چکے تھے۔''

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔۷۲)

> '' بلونت سنگھ اپنے زمانے میں لکھنے والوں میں ان کی عمر بہت کم تھی۔کم عمری میں ہی انہوں نے وہ مقام حاصل کیا جو بہت سے بڑے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ بلونت سنگھ کم عمری میں ہی وہ منزل حاصل کر لی جو تمام لوگوں کو خواب رہتا ہے۔آج بھی بلونت سنگھ پر بہت زیادہ مواد (کتابیں) موجود نہیں ہے یعنی کہ آج بھی بلونت سنگھ سے متعلق دستاویز نہیں مل پا رہے ہیں۔اردو فکشن نگاروں میں بلونت سنگھ ادبی دنیا میں بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔یہ وہ ادبی ستارہ ہیں جو آسمان کی بلندیوں پر روشن ہیں۔وہ فکشن کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔بلونت سنگھ پر قلم بند کرنا یعنی کہ سمندر سے چند مشکیزہ پانی نکالنے کے مترادف ہے۔بلونت سنگھ ایسے فکشن نگار ہیں جن کے یہاں عورتوں کے مسائل اور کسانوں کی محنت اور مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی بار بار دیکھنے کو ملتی ہے۔''

ان کی تخلیق کا ایک نمونہ 1944 میں پاکستان کے ایک معروف رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا کہ دنیاوی ادب میں ہل چل سی مچ گئی وہ افسانہ ''شہناز'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ یہیں سے انہوں نے افسانوی ادب میں اڑان بھرنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا گیا بلونت سنگھ بھی قدم در قدم بلندیوں کی سیڑھی پر چڑھتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک بہترین ہی نہیں ایک مشہور و معروف افسانہ نگار بن گئے۔ 1942 میں بلونت سنگھ نے الہٰ آباد سے بی۔اے کیا اور بلونت سنگھ کچھ عرصے کے لیے لاہور پاکستان منتقل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے مولانا صلاح الدین احمد (ایڈیٹر ادبی دنیا)، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جیسی بڑی شخصیتوں سے نہ صرف سرفراز ہوئے بلکہ ان کی صحبتیں بھی ملیں جس کی وجہ سے ان کے اندر نیا جوش، حوصلہ اور نئی سوچ پیدا ہو گئی۔ جس کا خاصا نتیجہ ان کی روح پر پڑی اور وہ نئی طاقت و ہمت کے ساتھ فکشن کی دنیاوی ادب میں آسمان کی بلندی پر (شاہ باز) شاہین کی مانند اپنے (ونگ) پر پھیلا دیئے۔ ان کے افسانے بے حد عمدہ ہیں۔ ''ادبی دنیا'' لاہور پاکستان سے شائع ہونے والے افسانے بہترین ہی نہیں بلکہ دلچسپ بھی ہیں۔ ان کا ایک ڈراما ''سکہ زن'' بے حد دلچسپ ہے جو ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ ان کے ڈراموں میں ''قلوپطرہ کی موت'' اور ''مرغی'' وغیرہ قابل ذکر ہے۔ اردو ادب سے متعلق آج بھی وہی دور چل رہا ہے جب سرکاری اداروں میں روپیہ پیسہ پانی کی مانند بہایا جاتا ہے اور تحقیق کے لیے انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ریسرچ کے لیے ہمارے پاس تمام دشواریاں سامنے آتی ہیں یعنی تحقیق کے عمل واصل کی چیز ریسرچ کے لیے وسائل محدود کر دیے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اچھے مواد دستیاب نہیں ہو پاتے۔ یہی حال بلونت سنگھ کے مواد کے متعلق رہا ہے۔ جمیل اختر لکھتے ہیں۔

> ''بلونت سنگھ سے متعلق مواد و رسائل کی مکمل فائل کسی ایک لائبریری میں نہ ملنے کی وجہ سے تمام کہانیوں کی دریافت یا تلاش ممکن نہیں ہو سکی۔ دوسرے، وسائل کی کمی بھی کہانیوں کی تلاش میں مانع رہی، سرکاری اداروں میں اشتہار پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور تحقیق کے لیے وسائل محدود کر دیے جاتے ہیں۔ جس سے معیاری تحقیق کا عمل پورا نہیں ہو پاتا اور آدھا ادھورا جو بھی محدود وسائل میں دستیاب ہو پاتا ہے اسے غنیمت جان کر اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔''

(کلیات بلونت سنگھ، جلد اول، جمیل اختر، ص۔ ۱۰)

بلونت سنگھ اردو کے ہی نہیں بلکہ ہندی کے ایک مشہور و معروف فکشن نگار تھے۔ ان کے افسانے، ناول اور ڈرامے اردو ادب میں ایک الگ اہمیت رکھتے ہیں۔ افسانوں وغیرہ سے متعلق اردو ادب میں تقریباً 30 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو کے ناول بھی ان کے بے حد عمدہ ہیں جس کی فہرست کافی لمبی ہے۔ بلونت سنگھ کے اردو ناول کی کتاب تقریباً 20 سے زائد ہیں جو الگ الگ موضوعات پر ہیں۔ ان سے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''بلونت سنگھ اردو کے ایک باکمال افسانہ نگار تھے، تقریباً تیس کتابوں کے خالق ہیں جن میں بیس سے زیادہ ناول ہیں۔ ان کی کتابیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں۔''

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ 07)

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جگا'' 1944 میں لاہور شائع ہوا۔ مولانا صلاح الدین احمد اپنے رسالے ''ادبی دنیا'' میں بلونت سنگھ سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بلونت سنگھ اردو کے بہت ہی نوجوان لکھنے والے ہیں۔ یعنی اگر وہ داڑھی منڈوائے ہوتے تو یہ مشکل سے باور آتا کہ یہ صاحبزادے گیند بلا کھیلنے کے بجائے صفحۂ قرطاس پر اشہب قلم دوڑاتے ہیں اور اس خوبی سے دوڑاتے ہیں کہ بعض اچھے اچھے شاہسواروں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں''

(بحوالہ بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ 9)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ سچ ثابت ہوتا ہے کہ بلونت سنگھ اپنے زمانے میں لکھنے والوں میں ان کی عمر بہت کم تھی۔ کم عمری میں ہی انہوں نے وہ مقام حاصل کیا جو بہت سے بڑے لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ بلونت سنگھ کم عمری میں ہی وہ منزل حاصل کر لی جو تمام لوگوں کو خواب رہتا ہے۔ آج بھی بلونت سنگھ پر بہت زیادہ مواد (کتابیں) موجود نہیں ہے یعنی کہ آج بھی بلونت سنگھ سے متعلق دستاویز نہیں مل پا رہے ہیں۔ اردو فکشن نگاروں میں بلونت سنگھ ادبی دنیا میں بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ یہ وہ ادبی ستارہ ہیں جو آسمان کی بلندیوں پر روشن ہیں۔ وہ فکشن کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

بلونت سنگھ پر قلم بند کرنا یعنی کہ سمندر سے چند مشکیزہ پانی نکالنے کے مترادف ہے۔ بلونت سنگھ ایسے فکشن نگار ہیں جن کے یہاں عورتوں کے مسائل اور کسانوں کی محنت اور مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی بار بار دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ پنجاب کی عورتوں، مزدوروں، کسانوں اور وہاں کی آب و ہوا کو بھی اپنی تخلیق کے ذریعے ایسے پیش کیا ہے وہ بالکل حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ وہ خود اپنے لطیفہ میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں پنجاب میں چند شریف عورتوں کی ایک کہانی مشہور ہے۔ وہ سفر کر رہی تھیں۔ گرمیوں کے دن، دوپہر کا وقت، دھوپ کی تمازت۔۔۔۔۔ روں روں کرتے ہوئے ایک رہٹ کے قریب بڑی گھنی چھاؤں دیکھ کر انہوں نے آرام کرنے کی ٹھانی۔ کھانا نکالا۔ جس میں لچیاں اور حلوہ بھی شامل تھی۔ لچی کو میدے سے بنی ہوئی لجلجی سی سفید پوری یا چپاتی سمجھ لیجئے۔ بڑی لذیذ ہوتی ہے۔ پرے ایک تھکا ماندہ ان گھڑ جاٹ بھی ستانے کے لیے آبیٹھا۔ اس نے بھی تنور کی پکی ہوئی بھاری بھرکم روٹیاں نکالیں اور ایک بڑی سی پیاز توڑنے ہی کو تھا کہ اس نے سنا آؤ بہنو! پہلے لچیاں کھائیں۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اپنی روٹیوں کی طرف دیکھا جو اس کی نیت کے فتور کو بھانپ کر اس کو یوں گھور رہی تھیں جیسے اسے کھا ہی جائیں گی مگر اس نے پروانہ کی اور روٹیوں کو لچیوں میں پھینکتے ہوئے بولا۔ لو بہنو! یہ دو لچ (بصیغۂ تذکرہ) میرے بھی شامل کر لو کہتے ہیں اس پر عورتوں کی لچیاں بھرشٹ ہو گئیں اور انہوں نے سب کچھ جاٹ کے حوالے کر دیا۔''

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۱۰۔۹)

بلونت سنگھ ایک نیک، ایماندار اور خوددار انسان تھے۔ وہ اپنی کھال میں مست رہتے تھے۔ لاہور میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور صلاح الدین احمد وغیرہ کا زمانہ تھا وہی

زمانہ آپ کا بھی رہا ہے۔یعنی یہ کہہ سکتے ہیں کہ بلونت سنگھ کے کھلنڈرے پن کا زمانہ تھا۔وہ اپنے آپ میں خوش رہتے تھے۔وہ کم لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند کرتے تھے۔وہ اپنے زمانے میں اور لوگوں سے بہتر تھے۔یعنی یہ کہہ سکتے تھے کہ سب سے ذہین تھے اور ساتھ ہی ساتھ باصلاحیت بھی تھے لیکن ان کا اصل حق ان کو نہیں ملا۔لہذا وہ سازشوں کے شکار رہے جس کا نتیجہ یہ رہا کہ ان کو ملازمت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔آخر میں لاہور چھوڑ کر الہ آباد میں منتقل ہوگئے۔وہ نہایت ذہین، وجیہ، شکیل خود دار اور تنومند شخص تھے۔وہ سچائی کے لیے چٹان کی مانند ڈٹے رہتے تھے وہ سادہ وصاف انسان تھے۔ان کا دل بے حد نازک اور سنجیدہ تھا۔وہ جھوٹ وفریب سے قطعی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔وہ حقیقت کے ساتھ اپنی بات رکھنے کا ہنر جانتے تھے۔اسی لیے بے ایمان لوگ ان سے کنارہ کش کرلیتے تھے۔ادبی حلقوں سے متعلق نارنگ لکھتے ہیں۔

”آزادی کے بعد جولائی ۱۹۴۸ء میں بلونت سنگھ پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت، ہند کے رسائل ”آجکل“،”بسط عالم“ اور”نو نہال“ کے ادارتی عملے سے وابستہ ہو گئے، لیکن یہ ملازمت ڈھائی سال کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں ختم ہو گئی جس کا دلچسپ احوال بلونت سنگھ نے اپنے رپوتاژ”عہد نو میں ملازمت کے تیس (۳۰) مہینے“ میں قلم بند کیا۔“

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۷۲۔ ۷۳)

بلونت سنگھ کو اپنے فن پر ناز تھا۔وہ فکشن کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے مگر افسوس یہ رہا کہ ان کی موت پر کوئی کندھا دینے نہیں آیا۔آخری وقت میں ان کو بطن (پیٹ) میں کچھ تکلیف ہوئی اور پھر بعد میں آنکھ کی روشنی بھی چلی گئی۔1968ء میں الہ آباد میں ان کا انتقال ہوگیا۔بقول گوپی چند نارنگ:

”1975ء میں انہیں انتڑیوں کی تکلیف شروع ہوئی تو انہوں نے چوک آبائی ہوٹل جو آمدنی کا واحد ذریعہ تھا فروخت کردیا۔پھر بینائی بھی جاتی رہی اور 1986 میں انتقال ہوگیا۔۔۔۔
1986 میں جب بلونت سنگھ الہ آباد میں کسم پرسی کے عالم میں اس دنیا سے اٹھ گئے تو ان کی لاش کو کندھا دینے والوں میں شاید ایک بھی ادیب نہ تھا۔ان کے انتقال کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور جب خبر ہوئی بھی تو سوائے ایک آدھ تحریر کے کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا۔“

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ 8۔7)

بلونت سنگھ ایسے فن کار تھے جس پر قلم اٹھالیں تو ایک سونامی آجاتی تھی یعنی کہ ان کی تحریر بے حد عمدہ تھی۔زبان وبیان بہت ہی صاف اور آسان تھی کہ قارئین کو بآسانی سمجھ میں آجائے۔ایسی پرلطف کہانیوں کے فنکار اردو افسانے، ناولوں اور ڈراموں کی تاریخ میں غالب ہے جو بلونت سنگھ کے یہاں موجود تھیں۔خود کرشن چندر کہتے ہیں کہ”بلونت سنگھ اپنے موضوع میں تنوع، تحریک میں شگفتگی اور ہر لحظہ ایک ایسا نیا پہلو پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر ہماری جمالیاتی حس کو مسرت حاصل ہوتی“۔یہ پوری طرح سچ ثابت ہوتی رہی۔ان کے ناولوں کی تعداد افسانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں ان کے جوہر اردو اور ہندی فکشن پر غالب ہیں۔گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

”اب تک کی معلومات کے مطابق گیارہ کتابیں اردو میں جن میں سات افسانوں کے مجموعے اور چار ناول اور تیس کتابیں ہندی میں شائع ہوچکی تھی۔تفصیل کتابیات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ان میں سے بعض کتابیں بار بار شائع ہوتی رہی ہیں۔“

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔9)

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلونت سنگھ نہ صرف اردو فکشن میں مہارت رکھتے تھے بلکہ ہندی میں بھی ایک کامیاب فکشن نگار ہیں۔اردو ہندی میں ان کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔یہ ہمیشہ ہندوستانیوں کے نہیں بلکہ دنیا میں فکشن سے دلچسپی رکھنے والوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے اور تاروں کے مانند چمکتے رہیں گے۔اردو ادب ان کے حق کو کبھی بھی ادا نہیں کرپائے گا۔

بلونت سنگ ایک بڑی اعظیم شخصیت کے مالک ہیں۔اردو اور ہندی میں تقریباً تین درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔بقول اوپندر ناتھ اشک۔

”تقریباً تین سو کہانیوں کا خالق ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد اخبارات میں ان کی موت کی خبر نمایاں طور پر شائع نہیں ہوئی اور جب ارتھی اٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔یہ کیسی دردناک موت تھی۔نہ ہی کسی رسالے نے شایان شان کوئی نمبر بھی شائع نہیں کیا۔سوائے چند ایک مضامین کے اور لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی۔“

(کلیات بلونت سنگھ، جلد اول، ص۔ ۳۳)

ہندی اور اردو ادب میں ان کا مقام ومرتبہ ہم عصروں میں زیادہ بہتر ہے۔اردو میں بلونت سنگھ کے افسانے جو صرف اردو میں لکھے ملتے ہیں۔ان کی تعداد ۷۵ سے زیادہ ہے۔”روشنی لٹکتی شاہین، عذاب، حد فاصل، دودھ بھریگلیاں، دانت ایک بات ایک، آشیانہ، لمس، دستک، سنگ آنداز، شکار کا شکار، ایک بھیگی شام، آزاد فاقہ، بھیک، جنگل مین منگل، اعتراف، ایک رات، ایڈیٹر لوگ، تعمیر، اللہ کا فضل، اس حمام میں، مداوا، بازگشت، صبح شام آرزو، بیمار، بھیک منگے، فلمی انٹرویو، جوا کی پوتی کا افسانہ، بھول بھلیاں، بات ایک رات کی، سکہ زن، بیڈ منٹن کی چڑیا، بادلوں کی چھاؤ تلے، واپسی، پھانس، جھرجھری، دیش بھگت، پنجاب کا البیلا، پردیشن، چار سو برس پہلے، پتھر کے دیوتا، کاتے، کاکو اور اس کے پریمی، پاسٹ، موت، پودے، پردیسی چاند، راستہ چلتی عورت، تین چور، تیاگ، پاسبان، کٹھن ڈگریاں، ٹارزن، خودا کی وصیت، کبھی، خلا، کمپوزیشن، ٹیچر، خوبصورت موڈ، ڈاکو، دل بلبل، سکوت، صابن کی ٹکیا، سہارا، سپنوں کا راہی، اور منی کی موت“ وغیرہ قابل ذکر ہے۔یہ تمام افسانے ہندی میں نہیں ملیں گے اور نہ آج تک ہندی میں شائع ہوا ہے۔

یہاں کچھ ادیبوں کا ماننا ہے کہ”چک پیرا کا جسا“ اردو میں لکھا ہوا افسانوی مجموعہ ہے جب کہ یہ ناول ہے۔ان کا ایک اور ناول”رات چور اور چاند“ جو ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا وہ ادارہ فروغ اردو لاہور، نقوش پریس سے شائع ہوا۔یہ ناول”نقوش“ میں قسط وار ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۱ء تک متواتر شائع ہوا تھا۔گوپی چند نارنگ کا بلونت سنگھ پر کام سب سے زیادہ اور سب سے عمدہ ہے۔اردو ادب میں بلونت سنگھ پر سب سے بہترین لکھا ہے۔اپنے مقدمہ

"سائیکی، ثقافت اور شکست رومان" میں بلونت سنگھ سے متعلق لکھتے ہیں۔

"ایسی پرلطف کہانیوں کا فن کار اردو افسانے کی تاریخ سے غائب نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔اگر چہ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور قاسمی کے فوراً بعد کے ماصرین میں ہونے کی وجہ سے ان پر نگاہوں سے جلد او جھل بھی ہو گئے۔تاہم سکھ سائیکی اور ثقافتی معنویت کی باز آفرینی کے اعتبار سے، نیز جگا، گرنتھی سورما سنگھ، وبیلے ۳۸، پہلا پتھر، دیش بھکت، کالی تیتری یا کٹھن ڈگریا کے خالق کی حیثیت سے اردو افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ محفوظ ہے۔ان کی خاص خاص کہانیوں کی قبولیت اور معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔ایسا افسانہ نگار وقتی طور پر نظر انداز تو ہوسکتا ہے، وقت اسے ہمیشہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔"

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔33)

ان کی خالص ہندی کی کہانیون کی فہرست تقریباً (۵۰) پچاس سے زیادہ ہے۔جیسے۔" زندگی کا خوبصورت موڑ، دل نادان، پیلاں، دیوتا کا جنم، دنڈ، لاٹری زندہ باد، آگے کے دو دانت، میں ضرور رووں گی، پرتی دھونی، قبرستان کی حسینہ، اندھیرا اجالا، شام کے دھند لکے، راہی، چور، چالس سال بعد، اڑان، کنیادان، اس رات کی بات، کچھ چھن، بادام نگین، بہو، کیا کریں دونوں، بنواس، رکھوالا، بھیگتی پلکیں، پٹھان، تتلیاں، گرینڈ ہوٹل، پریچے، لاٹری، زندہ باد، ترپتی، شونیہ، ست رنگا کبوتر، تنتر، تاحیات، وشاتینج ننھا پھچھکو، سوابھیمان، ٹکسال والا، دو بہنیں، جنازہ، چندرلوک، اور جیجاجی" وغیرہ قابل تعریف ہے۔

بلونت سنگھ بہترین فکشن نگار کے ساتھ ساتھ اچھے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ان کے ڈرامے اور مضامین بے حد عمدہ ہیں۔ڈراموں میں جیسے۔"پامال محبت"، "پھانسی" اور "سکہ زن" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کے کارناموں میں کچھ بہترین ناولٹ بھی شامل ہیں جیسے۔" عہدِ نو میں ملازمت کے تیس مہینے وغیرہ بے حد دلچسپ ہیں۔ان کے مضامین کچھ اس طرح ہیں جیسے۔"چارسو برس پہلے"، "حضرت چھچھوندر چھچھوندری، ایڈٹر لوگ اور فراق گورکھ پوری اور کرشن چندر وغیرہ سے لئے گئے انٹرویو بھی شامل ہیں جو قبل تعریف ہے۔بلونت سنگھ کی وفات ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔یہ ہندی، اردو کے عمدہ ناول اور افسانہ نگار تھے۔وہ اپنے تحریروں کے ذریئے سچائی کو بے باکی سے لکھتے تھے۔وہ پنجاب کی دیہاتی زندگی کو بالکل حقیقت کے ساتھ تخلیق کرتے تھے۔ان کی زبان بے حد آسان، سادہ و آم فہم تھی جس مطالعہ کرتے وقت بآسانی سمجھا جاسکے، یہ باتوں کا خیال وہ ضرور رکھتے تھے۔اسی لئے ان تقریباً سبھی ناول، افسانے اور ڈرامے زیادہ پسند کئے گئے۔ان سب کے علاوہ وہ ایک بہترین صحافی بھی تھے۔وہ آجکل اردو رسالہ وغیرہ میں ایڈٹر کا عمدہ کام کیا ہے۔وہ رسالہ آج کل کو اس بلندیوں پر پہنچا دیا جہا اسے ہونا چاہئے۔اسی لئے اس رسالہ مرتبہ قائم و دائم ہے۔بلونت سنگھ نہ صرف اردو فکشن نگار ہیں بلکہ اس کے علاوہ ہندی کے بھی بہترین فکشن نگار مانے جاتے ہیں۔ان کے ہندی ناول بے حد دلچسپ ہیں جو ہندی ادب میں دستیاب ہیں۔

بلونت سنگھ اور کرشن چندر کے تعلقات بہت اچھے تھے دونوں میں ہنسی مذاق کرتے تھے کیوں کہ یہ ہنسی مذاق ان کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔مگر سینئر کو اہمیت دیتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے۔بلونت سنگھ سے متعلق گوپی چند نارنگ نے لکھا ہے کہ "بیجا پور بیدی قریب تھا۔پھانس لیا میں نے۔۔۔۔۔۔۔اصل مرغ کی طرح ڈٹا رہا یعنی میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں۔" کرشن چندر اور بلونت سنگھ کے تعلقات کچھ اسی طرح کے تھے۔وہ شرارت تو کرتے ہی تھے لیکن عزت کا نہایت خیال بھی رکھتے تھے۔ان کی دوستی نہایت دلچست تھی۔بلونت سنگھ ایسے فنکار ہیں جو صرف حقیقت یعنی سچائی سے ناتا رکھتے ہیں۔وہ بہت ہی ذہین انسان تھے فکشن پر ان کی گرفت اسے تھی جیسے وہ میر اور غالب کو شاعری پر تھا۔ان کے ادبی کارنامے دنیا کے کونے کونے رقص کر رہی ہے۔ان کا سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی تجربہ قابل قبول تھا اسی لئے ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کے جیتے جاگتے کردار خوب دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ حقیقت پسندی تھے اس لئے جھوٹھے اور فریبی لوگوں کو ناپسند کرتے تھے۔حقیقت پسندی کی جھلک ان کی کہانیوں میں خوب ملتے ہیں۔بقول گوپی چند نارنگ۔

"یہ خیالی حقیقت خلق ہوئی تھی۔اس میں اشیا اور انسان کا تصور کیا تھا یعنی کیا کوئی نقطہ نظر یا افتادِ طبع ایسی تھی جس سے بلونت سنگھ کے اظہاری رویئے کو تعبیر کیا جاسکے۔بلونت سنگھ کی ذہنی فضا کی تشکیل میں او پر جن اثرات وعوامل کا اشارہ کیا گیا، اس سے ظاہر ہوتا کہ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جن کی شہرت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔جتنا وہ انکی طرف کھنچے، اتنا خود کو ان سے کھینچتے بھی گئے۔"

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔۱۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلونت سنگھ واقعئ میں حقیقت پسند مصنف ہیں۔وہ سچائی کے ساتھ بے باک لکھتے ہیں وہ بے باک فکشن نگار ہیں۔ان کی تمام کتابیں اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ صرف فکشن کے دنیا میں نہ صرف آفتاب ہیں بلکہ شاعری اور ڈرامے بھی روشن ہیں جو بے حد عمدہ ہیں۔

"بلونت سنگھ کا فن فقط رومان نگاری کا فن نہیں، یہ شکست رومان کا سنگین منظر نامہ بھی پیش کرتا ہے، جہاں انسانی شرافت کو انسانی رذالت کاٹتی ہے اور اس رخ سے دیکھئے تو بھی بعض ایسے کردار سامنے آتے ہیں جو افسانوی اور جمالیاتی طور پر نہایت اثر آفرین ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کھلتی ہے کہ بلونت سنگھ کے یہاں کردار فقط نہیں یا واقعات فقط واقعات نہیں، بلکہ سب کچھ اس وسیع منظر نامے پر تشکیل پاتا ہے جس کو ثقافتی جغرافیہ کہنا چاہئے۔اس میں قصبوں کی فضا اور مٹی کی نو باس تو ہے ہی، لیکن فقط کھیت کھلیان یا سرسوں کا پھول ہی نہیں، طور طریقے، رہن سہن، پوجا پاٹھ، شبد کیرتن، میلے ٹھیلے تیج تہوار، گانا بجانا، رسمیں عقیدے، سبھی کچھ، جس سے پوری سائیکی اور ثقافت عبارت ہے۔یہ کردار زندہ اس لئے لگتے ہیں کہ اپنے ثقافتی خلقیہ میں سانس لیتے ہیں۔"

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔۶۹)

بلونت سنگھ بڑے اعزاز کے مستحق تھے۔مگر ان کی زندگی میں (گوپی چند کے مطابق) صرف تین ایورڈ ہی ملے ہیں۔اتر پردیش سرکار کا ادبی ایوارڈ، بھاشا وبھاگ حکومت پنجاب کا ادبی ایوارڈ، پنجاب سے ہی شرومنی ساہتیہ ایوارڈ بہت ہی نہایت عزت کے ساتھ

دیا گیا۔ مجھے لگتا ہے کی ان کو اتنے کم ایوارڈ ملے کیوں کہ وہ حقیقت پسند تھے۔ ان کے اندر بے ایمانی نہیں تھی۔ وہ بہت خوددار انسان تھے، چاپلوسی اور چغل کھوری سے دور دور تک ان کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ صرف یمانداری سے اپنے کام کو انجام دیتے تھے۔ وہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں بڑی خوبصورت سے تخلیق کرتے تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد چالس (۴۰) سے زیادہ ہے۔ وہ بائیس (۲۲) ناول اور تین (۳۰۰) کہانیاں لکھے ہیں۔ اسی لئے وہ آج بھی ادبی حلقوں میں روشن آفتاب ہیں۔ ان کی کتابوں کی فہرست کی جھلک آپ کی نظر کرتا ہوں۔ ''جگا'' افسانہ ۱۹۴۴ء میں ''ہندوستان ہمارا ہے'' افسانہ ۱۹۴۷ء، ''رات چور اور چاند'' ناول ۱۹۴۸ء، ''تارو پوڈ'' افسانہ ۱۹۴۴ء، ''پہلا پتھر'' افسانہ ۱۹۵۳ء، ''ایک معمولی لڑکی'' ناول ۱۹۵۹ء، ''عورت اور آبشار'' ناول، ''کالے کوس'' ناول، ''سنہرا دیش'' افسانہ، ''چک پیراں کا جسا'' افسانہ، غیر مدون ۔۔۔ ''عہد نو میں ملازمت کے تیس مہینے'' طویل افسانہ نمار پورتاژ، ''مطوعہ سویرا لاہور''، ''بلونت سنگھ کے افسانے'' وغیرہ اردو کی بہترین کتابیں ہیں مگر ہندی کی بھی کتابوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جیسے ۔۔۔ ''پنجاب کی کہانیاں'' (منتخب افسانے) ۱۹۵۴ء، ''دو اکال گڑھ'' ۱۹۶۹ء، ''بخوبی نواس'' ۱۹۶۱ء، ''امرتا پرتم کی بتاؤں آلو چنا'' ۱۹۶۲ء، ''آگ کی کلیاں'' ۱۹۶۲ء، ''عورت کا آبشار'' ۱۹۶۲ء، ''باسی پھول ۱۹۶۵ء، ''سونا آسمان'' ۱۹۶۷ء، ''چلمن'' ۱۹۷۰ء، ''میری پریہ کہانی'' ۱۹۷۱ء، ''پہلا پتھر'' ۱۹۷۱ء، ''پھول کھل اٹھے'' (بچوں کا ناول) ۱۹۷۱ء، ''رات کی منزل'' ۱۹۷۱ء، ''سنہرے بالوں والی'' ۱۹۷۳ء، ''پھر صبح ہوگئی'' ۱۹۷۴ء، ''رات چور اور چاند'' ۱۹۷۴ء، دیوتا کا جنم'' ۱۹۷۷ء، ''چک پیراں کا جسا'' ۱۹۷۷ء، ''بن باس تتھا انتیہ کہانیا'' ۱۹۷۸ء، ''صاحب علم'' ۱۹۷۹ء، ''ہونی ان ہونی'' ۱۹۷۹ء، ''راوی پار''، ۱۹۸۰ء، ''ایلی ایلی'' ۱۹۸۲ء، ''کالے کوس'' ۱۹۸۲ء، ''ایک معمولی لڑکی''، ''نشی''، ''مونا'' ۱۹۸۳ء، ''سیندر کی تلاش'' ۱۹۸۳ء، اور ''قصہ چار درویش'' ۱۹۸۶ء قابل ذکر ہیں۔

بلونت سنگھ کے والد کے بعد کی زندگی ہندوستان کی سرزمیں پر گزری یعنی کی ان کے والد کے جانے کے بعد وہ الہٰ آباد میں ہمیشہ کے لئے منتقل ہو گئے۔ اور ''امپیریل ہوٹل'' کی نگرانی کرنے لگے۔ مگر ان کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا یعنی کی ان کا کافی وقت کتابوں کا مطالعہ کرنے میں صرف ہوتا اور کچھ وقت بعد بیماری کی وجہ سے ہوٹل فروخت کر دیا اور نیتاجی نگر میں اپنی ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھی پہلی بیوی سے رشتہ کچھ اچھا نہ رہا اس لئے طلاق ہوگیا پھر دوسری شادی کی وہ کسی مقامی کالج میں درس تدریس خدمت انجام دے رہیں تھی۔

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۱۱)

بلونت سنگھ کا بچپن کچھ یوں گزرا۔ وہ نہایت شرارتی تھے اور آوارہ گردی کرتے رہتے تھے۔ جیسے تقریباً سبھی بچے کرتے ہیں کسی طرح اسکول میں داخلہ دلایا گیا وہ بانسری خوب بجاتے تھے جیسے شری کرشن جی بجاتے تھے۔ مگر وہ خوش مزاج اور خوش فہمہ اور ہرفن مولا تھے۔ ان کا ٹھاٹھ باٹ بادشاہی تھا۔ بلونت سنگھ سے متعلق اوپیندر ناتھ اشک کہتے ہیں۔ جس کو گوپی چند نارنگ تخلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''وہ منجھلے قد اور دوہرے جسم کے گورے چٹے، تندرست وتوانا، بے حد خوبصورت انسان تھے۔ اکیلے پکچر دیکھتے تھے، اور تو اور سول لائنز کے کافی ہاؤس میں اکیلے کافی پیتے تھے۔ صبح کو بغیر پوری طرح سجے دھجے وہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ جن دنوں ہوٹل چلاتے تھے، انہوں نے ایک بڑا السیشین کتا پال رکھا تھا۔ باہر نکلتے تو پورا رکشا پر اپنے تنومند جسم کے ساتھ پھیل کر بیٹھتے اور پیروں میں السیشین کتا لیٹا رہتا۔ سول لائنز اور گردونواح کے علاقے میں رکشا پر اسی شان سے آتے جاتے نظر آجاتے تھے۔''

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۷۳)

بلونت سنگھ فکشن کی دینا سے کبھی بھی فراموش نہیں ہو سکتے ہیں۔ ان کی کہانیاں بے حد دلچسپ اور ترقی عافتہ ہیں۔ سماج کو صحیح صلاحیت کرتے ہیں ان تمام کہانیوں کا مطالعہ کر ہماری جمالیاتی حس کو مسرت ہوتی ہے۔ ان کی کہانیاں ہر اعتبار سے صحیح مفید ثابت ہوتی ہیں۔ بقول گوپی چند نارنگ:

> ''یہ آخری جملہ بلونت سنگھ کے ذہن کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہے۔ یعنی غیر یقینی صورتِ حال میں اپنی صلاحیت پر بھروسا بھی، اور معاصرین کے مقابلے میں عدم تحفظ اور عدم تکمیلیت کا احساس بھی۔ یہ کلید ہے بلونت سنگھ کے فن کی تفہیم کی جیسے جیسے زمانہ گرتا گیا اور حالات نے انہیں لاہور سے نکال کر دہلی اور پھر دہلی سے نکال کر الہٰ آباد میں پھینک دیا، اور جتنا وہ اپنے آپ میں سکڑتے گئے، اتنا ہی ان کے لکھنے کی رفتار بڑھتی گئی اور وہ اپنے تخئیل کی خلق کی ہوئی دنیا میں مگن ہو گئے۔''

(بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۱۱)

اس سے یہ پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ بلونت سنگھ ایک حقیقی، انسانیت پسند ایماندار محنتی اور خوددار انسان کے ساتھ ساتھ ایک بہترین تخلیق کار، فکشن نگار، ڈرامہ نگار اور عمدہ ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کہانیاں آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ رہیں گی اور ہمیں فائدہ پہنچاتی رہیں گی۔ آج ان پر سیمینار کرائے جارہے ہیں اور ان پر ریسرچ پیپر پڑھے جارہے ہیں۔ ان کی تمام کتابیں منظرے عام پر آرہی ہے، یہی نہیں دنیا کے تمام یونیورسٹیوں میں بلونت سنگھ پر تحقیق یعنی ریسرچ ہو رہا ہے۔ بلونت سنگھ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

❑❑❑

التماس

''ماہنامہ نیادور'' کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائیل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

محمد طلحہ

ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، ایف آر کے ہاسٹل، نئی دہلی

8574080774

شارب ردولوی کی ادبی خدمات

بیسویں صدی کے اوائل سے ہی ہندوستان میں ادبی، سماجی اور سیاسی سطح پر ہنگامہ خیز ماحول تھا۔ ایک طرف تحریک آزادی زوروں پر تھیں تو دوسری طرف ادبی تحریکیں بھی سرگرم تھیں۔ تحریک آزادی نے ادبی ماحول کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ اس صدی میں عظیم شعراء و ادباء اور ناقدین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنی تخلیقات سے تحریک کی ہوا کو تیز کرنے میں مدد کی۔ اس دوران اردو ادب میں ایسے ایسے شاعر اور دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے سیاسی اور ادبی دونوں حلقوں کو متأثر کیا اور اس میں ایک نئی روح پھونکی۔ ہندوستان کی سرزمین پر تحریک آزادی کے تئیں ادیبوں اور شاعروں کی کئی جماعتیں وجود میں آئیں جس میں ترقی پسند تحریک کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہرکیف اس درمیان ہندوستان میں کئی اہم شخصیات نمودار ہوئیں جنہوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی فضا کو مالا مال کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا اور اپنے تخلیقی سرمایہ سے اردو ادب کو نئی فکر سے روشناس کرایا۔

اس میں ایک اہم ادیب اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک "شارب ردولوی" تھے جو اودھ کے مشہور قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی کے محلہ عباسی میں حکیم حسن عباس اور امیر النساء کے معزز اور ذی علم اہل تشیع گھرانے میں ۶/ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ بمطابق ۱۳/مارچ ۱۹۳۲ء بروز جمعرات علی الصبح پیدا ہوئے اس نومولود کا نام مسیب عباس رکھا گیا۔ تعلیمی سرٹیفکیٹ ملازمتوں اور دیگر سرکاری کاغذات مختلف ادبی رسائل و اخبارات میں یکم ستمبر ۱۹۳۵ء تاریخ پیدائش درج ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ردولی کے مشہور ادیب مورخ سید علی محمد زیدی نے اپنی تصنیف "اپنی یادیں اور ردولی کی باتیں" میں لکھا ہے "والد کا اسم گرامی حکیم حسن عباس محلہ عباسی کے رہنے والے یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو ولادت ہوئی۔ ڈاکٹر نکہت ریحانہ خان نے اپنی کتاب "منظر پس منظر" میں لکھا ہے مسیب عباس شارب ردولوی یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو یوپی کے مردم خیز قصبے ردولی بارہ بنکی کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شارب ردولی چونکہ کم عمری ہی میں والدہ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے تھے اس لئے خاندان کے تمام افراد کی محبتیں انہیں حاصل رہیں کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے ان کے دل شکنی ہو ان کے دادا حکیم غلام حسین ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انکی ابتدائی تعلیم میں دادا کا سب سے بڑا ہاتھ ہے انہوں نے دادا سے قرآن مجید، آمد نامہ اور گلستان و بوستان کی تعلیم حاصل کی اس لئے انکی شخصیت پر سب سے زیادہ اثر دادا کا پڑا۔ ماسٹر محمد موسیٰ ان کے اتالیق تھے۔ جن سے انہوں نے حساب، انگریزی اور ابتدائی درجات کے دوسرے مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ پرائمری اسکول میں ان کے استاد مولوی رونق علی تھے۔ جو ردولی اسکول کے ہیڈ مدرس تھے ابتدائی تعلیم ردولی سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے اور یہیں سے پی ایچ ڈی کی۔ انکے مقالے کا موضوع جدید اردو ادبی تنقید کے اصول تھا۔ انہوں نے پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی ۱۹۶۱ء میں دیال سنگھ کالج دہلی یونیورسٹی میں اردو لکچرر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں بیورو فار پرموشن آف اردو وزارت تعلیم و سماجی بہبود میں پرنسپل پبلیکیشن افسر کی حیثیت سے تقریری ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں وزارت تعلیم سے استعفیٰ دے دیا اور دیال سنگھ کالج میں بحیثیت لکچرر خدمات انجام دینا شروع کیا۔ ۱۹۹۰ء میں دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں تقرری ہوئی۔ ۱۹۹۳ء میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں سنٹر آف انڈین لینگویجز میں بحیثیت پروفیسر تقرری ہوئی ۲۰۰۰ء میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے سبکوش ہوئے۔

اردو ادب کے جدید نقادوں میں پروفیسر شارب ردولوی کا نام نہایت اہمیت و مقبولیت کا حامل ہے۔ ان کی تنقیدی فکر و شعور ترقی پسندی کے سائے میں پروان چڑھی ہے چونکہ انہیں ترقی پسند ادب اور تحریک دونوں ہی سے دلچسپی رہی ہے اس لئے انہوں نے اپنی تنقیدوں میں بھی وہی انداز اختیار کیا ان کی تنقیدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی ادیب

> "پروفیسر شارب ردولوی نے انگریزی نقاد کو بطور اپنی تنقید کے لئے نہیں اپنایا ہے۔ تنقید دراصل ایک نہایت مشکل میدان ہے اور وادی تنقید میں داخل ہونا اور اس کے اونچے اونچے خم دار راستوں سے بہ آسانی گزر جانا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض افراد مختلف النوع صفات و خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا کوئی ایک پہلو اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ تمام لوگوں کی نظر اسی نمایاں پہلو پر رک جاتی ہے اور دوسری فنی خصوصیات کی جانب توجہ بھی نہیں جاتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پروفیسر شارب ردولوی کے ساتھ بھی ہوا کہ انہوں نے علم و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنا جوہر کمال دکھایا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا اقرار ماہرین علم و فن سے کرایا لیکن بین الاقوامی شہرت ایک تنقید نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی اور ایسا کیوں کر نہ ہوتا کہ جب انہوں نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا اس وقت تو انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات کے لئے پہلے مرثیہ ہی کو تختۂ مشق بنایا۔"

کے فکر وفن کا اندازہ اس کے سماجی اور سیاسی حالات سے کرتے ہیں۔ اسی کڑی میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کا ایمانداری سے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا: ''ترقی پسند تحریک اپنی ابتداء سے ایک نظریاتی تحریک رہی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا مثبت اور منفی پہلو ہے۔ آج جس ترقی پسند تحریک کا ذکر کیا جاتا ہے اس کا سلسلہ تو وہی ہے لیکن نظریاتی اعتبار سے اس کی تین تہیں ہیں''۔ شارب ردولوی نے خوبصورتی کے ساتھ ان تینوں تہوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا کہ ترقی پسند تحریک میں ہوئی بعض غلطیوں کا بہانا لے کر اس پر لگائے جانے والے بہت سے الزامات حقیقت پر مبنی نہیں تھے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

'سجاد ظہیر نے سکہ بند ترقی پسند کی اصلاح کی جواب اور آرٹ کو پارٹی لائن پر چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' ''جدید اردو تنقیدی اصول ونظریات'' انکی مشہور تنقیدی کتاب ہے۔ اور اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر اردو تنقید کی ارتقائی منزلوں اور مختلف نظریاتی و بتانوں کا تجزیہ ممکن نہیں ہے انکے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تنقیدی مباحث'' میں نو تنقیدی'' اور ''ہم عصر اردو تنقید'' کے مطالعے سے بھی ادب کے مختلف رجحانات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے انگریزی نقاد کو بطور اپنی تنقید کے لئے نہیں اپنایا ہے۔ تنقید دراصل ایک نہایت مشکل میدان ہے اور وادی تنقید میں داخل ہونا اور اس کے اونچے اونچے خم دار راستوں سے بہ آسانی گزر جانا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض افراد مختلف النوع صفات وخصوصیات کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا کوئی ایک پہلو اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ تمام لوگوں کی نظر اسی نمایاں پہلو پر رک جاتی ہے اور دوسری فنی خصوصیات کی جانب توجہ بھی نہیں جاتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پروفیسر شارب ردولوی کے ساتھ بھی ہوا کہ انہوں نے علم و ادب کے مختلف میدانوں میں اپنا جوہر کمال دکھایا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا اقرار ماہرین علم وفن سے کرایا لیکن بین الاقوامی شہرت ایک تنقید نگار کی حیثیت سے حاصل ہوئی اور ایسا کیوں کر نہ ہوتا کہ جب انہوں نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا اس وقت تو انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات کے لئے پہلے مرثیہ ہی کو تختۂ مشق بنایا جس کو معمولی صنف سمجھ کر لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف نے اپنا لوہا منوایا۔ اور مرثیہ کی جانب ماہرین علم وفن متوجہ ہوئے۔ یوں تو اس صنف سخن میں طبع آزمائی کے ساتھ حالی وشبلی اور مسعود حسن رضوی ادیب جیسے ناقدین نے مرثیہ گویوں کے کلام کا جائزہ لیا تھا اور ان کے کلام کے متعلق اپنی بیش قیمت تنقیدی آراء پیش کی تھیں۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر پر کتاب لکھی جو اردو تنقید میں انیس کے مرثیوں میں ڈرامائی عناصر کی تلاش کے حوالے سے نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ انھوں نے اس کتاب میں مراثی انیس سے مثالیں دے کر ان مقامات کی نشاندہی کی ہے جن مقامات پر انیس کے مرثیوں میں ڈرامائی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں شارب ردولوی نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس کے متعلق پروفیسر احتشام حسین کا کہنا ہے کہ: شارب ردولوی نے ایک منصفانہ اور ناقدانہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہوئے پہلے ڈرامے اور مرثیے کی خصوصیات پر الگ الگ نظر ڈالی ہے، پھر ان کے مشترک عناصر مثال کے طور پر ترتیب واقعات، کردار نگاری کشمکش تصادم عمل اور بنیادی مقصد سے بحث کی ہے ان کے پیش نظر خاص طور سے وہی نقطہ رہا ہے جو ارسطو نے المیہ کے متعلق قایم کیا تھا۔ یہاں انھوں نے دیدہ وری اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر مطابقت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لیے مراثی انیس سے بہت مناسب مثالیں تلاش کی ہیں اور بحث کو زیادہ پیچیدہ بنائے بغیر اپنے خیالات سادگی اور صفائی سے پیش کیے ہیں۔''

پروفیسر شارب ردولوی تقریباً ۱۴ کتابوں کے مصنف تھے ان میں اسرار الحق مجاز (مونو گراف)، مرثیہ اور مرثیہ نگار، جدید اردو تنقید اصول ونظریات، تنقیدی مباحث (مضامین)، معاصر اردو تنقید (مرتب)، انتخاب غزلیات، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید (مرتب)، اردو مرثیہ (مرتب) تنقیدی مطالعے (مضامین)، مطالعہ ولی، جگر فن اور شخصیت، افکار سودا، گل صدر نگ (۱۹۶۰ء میں حیات غزل گو شعراء کا انتخاب) اور مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر ہیں وہیں انکی زیر طبع کتابوں میں تنقیدی عمل اور افسانہ اور افسانہ نگار شامل ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ کے علی گنج میں رہائش اختیار کی۔ ان کا اردو دنیا میں بڑا اور معتبر نام تھا۔ ان کے اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے ایک لڑکی شعاع فاطمہ کو گود لیا تھا جس کا ۲۰ سال کی عمر میں ۱۹۹۵ء کو انتقال ہو گیا بیٹی کے انتقال کے بعد وہ ذہنی طور پر بہت ٹوٹ گئے تھے۔ انہوں نے بیٹی کی یاد میں شعاع فاطمہ تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ قائم کیا اسی کے تحت شعاع فاطمہ پبلک گرلس انٹر کالج قائم کیا جو اس وقت یو پی بورڈ سے انٹر میڈیٹ تک تسلیم شدہ ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی کینی اعظمی اکادمی کے صدر بھی تھے۔ اردو کے لئے ہمیشہ سرگرم رہا کرتے تھے۔ انتہائی نرم گفتار اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ اردو کی تقریب میں ایک عام شخص کی دعوت کو بھی قبول کرتے۔ عمر کے آخری دنوں میں ضعیفی کی وجہ سے ہر تقریب میں شرکت ممکن نہیں ہوئی لیکن کوشش کرتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پروگراموں میں شرکت کریں۔ چار سال قبل ۱۸/اکتوبر ۲۰۱۹ء کو انکی اہلیہ پروفیسر شمیم نکہت کے انتقال کے بعد انکی یاد میں شمیم نکہت ایوارڈ شروع کیا۔ ہندوستان بھر سے بڑی تعداد میں اہم شخصیات کو ایوارڈ سے نوازتے ہیں۔

پروفیسر شارب ردولوی مختلف علمی اداروں سے وابستہ رہے۔ وہ ۲۰۰۹ء میں یو پی اردو اکادمی کے ممبر رہے۔ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۰ء تک ممبر بورڈ آف منجمنٹ آف دی اکیڈمی پروفیشنل ڈیولپمنٹ اینڈ اردو میڈیم ٹیچرس جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۰ء تک ممبر گورننگ کونسل غالب اکیڈمی نئی دہلی رہے۔ ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۸ء تک ممبر بورڈ آف اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی رہے۔ ۱۹۹۶ء سے تاحال اس کے علاوہ چیئرمین ایکسپرٹ کمیٹی برائے نصاب اترا کھنڈ اوپن یونیورسٹی ہلدوانی سکریٹری دہلی یونیورسٹی لکھنؤ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ممبر بورڈ آف اسٹڈیز رہے انہوں نے مصر، شام، لبنان، عراق، کویت، کنیڈا، پاکستان، امریکہ، دوبئی وغیرہ ممالک کا سفر بھی کیا۔ آخر کار ۱۸/اکتوبر ۲۰۲۳ء ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شارب ردولوی ایک درجن سے زائد اہم ایوارڈ سے سرفراز ہوئے ان میں حکومت یو پی سے یش بھارتی ایوارڈ کے علاوہ کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، اردو اکادمی دہلی ۲۰۱۹ء، مغربی بنگال اردو اکیڈمی نیشنل ایوارڈ (۲۰۱۲) ۲۰۱۵، غالب ایوارڈ، اردو ہندی ساہتیہ ایوارڈ ۲۰۰۹ء سمیت دیگر ایوارڈ شامل ہیں۔

'پروفیسر احتشام حسین نے اپنی کتاب ''تنقید اور عملی تنقید'' میں لکھا ہے:

''تنقید نگاری کئی حیثیتوں سے سب سے مشکل ترین اور ذمہ دارانہ صنف ادب ہے نقاد ایک لحاظ سے پڑھنے والوں اور مصنفوں کے درمیان رابطہ کا کام دیتا ہے لیکن جس طرح اکثر مائیں اپنے بچے میں عیب نہیں دیکھتیں یا دیکھنا نہیں چاہتیں، اسی طرح اکثر مصنف اپنی تصنیف میں کسی طرح کی خامی تسلیم نہیں کرتے۔ تقریباً ہر مصنف یہ چاہتا ہے کہ اس کے متعلق نقاد منصفانہ رائے دینے کے بجائے اسکی تصنیف کا ایک اشتہار لکھ دے اور جب اسکی یہ آرزو پوری نہیں ہوتی تو وہ نقاد کو گالیاں دیتا ہے۔

❑❑❑

غزل

ہم اہل جنوں آنکھ میں کیا کیا نہیں رکھتے
دریا نہیں رکھتے ہیں کہ صحرا نہیں رکھتے

یہ کون ہیں جو آئینہ سازی میں لگے ہیں
یہ کون ہیں جو کوئی بھی چہرہ نہیں رکھتے

آواز لگا دیتے ہیں بیتے ہوئے کل کو
ہم خود کو کسی وقت بھی تنہا نہیں رکھتے

اک شہر تماشا کے تماشائی ہیں لیکن
ہم گھر میں کوئی لطف تماشا نہیں رکھتے

ہم لوگ بھی صحرا میں بگولوں کی طرح ہیں
منزل نہیں رکھتے کوئی رستہ نہیں رکھتے

جو ہم کو بنانا ہے وہ منظر ہی بنے گا
ہم چاک پہ دنیا کا تماشا نہیں رکھتے

ہم رائگاں لوگوں کی کہانی بھی عجب ہے
دنیا میں ہیں اور منصب دنیا نہیں رکھتے

ہم تشنہ لبوں کے لئے آنکھیں ہی بہت ہیں
تمثیل میں بھی ہم کوئی دریا نہیں رکھتے

شانوں پہ تری زلف کا احساس ہے ورنہ
یہ دشت بلا خیز تو سایہ نہیں رکھتے

شعیب نظام

105/591 حافظ حلیم کمپاؤنڈ چمن گنج کانپور 208001

8960416841

غزل

مرے سخن میں نئے پن کی جستجو بھی تو ہو
تمام شعروں میں تخیل کی نمو بھی تو ہو

خود اپنی تیغ کا منھ ڈھانپ کر رکھا ہم نے
عدو سمجھتی ہے دنیا جسے عدو بھی تو ہو

زمین اپج سے ہو محروم تو کراہ اٹھے
کہ میری کرب وبلا میں مرا لہو بھی تو ہو

نماز عشق پڑھیں اور بس تجھے دیکھیں
ہماری آنکھوں میں گنجائش وضو بھی تو ہو

بلا بھی سکتے ہیں اس کو ہم اپنے ہونٹوں تک
ہماری پیاس کو دریا کی جستجو بھی تو ہو

الجھ گئے ہیں مری فکر کے سبھی دھاگے
یہ دل کا زخم کسی طور اب رفو بھی تو ہو

ابھی مناؤں گا دل کی تباہیوں کا جشن
مرے ہی جیسا کوئی میرے روبرو بھی تو ہو

اسی لئے تو میں اس دن بچھڑ گیا چپ چاپ
ترے کہے ہوئے لفظوں کی آبرو بھی تو ہو

کرید سکتے ہیں ماضی کی راکھ کو بھی شوقؔ
ہماری آنکھوں میں جینے کی آرزو بھی تو ہو

سنجے مصرا شوق

لکھنؤ

7905471168

غزل

تو جو چاہے کمال دے مجھ کو
سیدھے رستے پہ ڈال دے مجھ کو

یادِ ماضی نہ فکرِ مستقبل
حال ہی حسبِ حال دے مجھ کو

منتظر میں مسرتوں کا ہوں
تیری مرضی ملال دے مجھے کو

میرے دشمن تو باشعور نہیں
دوست ہی خوش خصال دے مجھ کو

جس کا کوئی جواب دے نہ سکے
کوئی ایسا سوال دے مجھ کو

خوشبوؤں سا بکھرنے والا ہوں
خاکداں سے نکال دے مجھ کو

دھوپ نیزے ہوں بے اثر مدہوشؔ
عزم کی ایسی ڈھال دے مجھ کو

مدہوش بلگرامی
باہیرا سودا گرایسٹ، ہردوئی
9696778136

غزل

کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے گزری ہوں
تمام عمر میں وہم و گماں سے گزری ہوں

میری حیات میں اک پل کو بھی سکوں نہیں
یونہی سلگتی رہی میں دھواں سے گزری ہوں

کوئی نہیں تھا جو مجھ کو سنبھالتا آ کر
میں اپنی ذات کے ٹوٹے مکاں سے گزری ہوں

کہیں پہ قحط تو کہیں آندھیاں کہیں سیلاب
تمام عمر ہی میں امتحاں سے گزری ہوں

کبھی نجات کا ساماں نہیں میسر ہوا
ہمیشہ آتش غم کے دھواں سے گزری ہوں

نکل نہ پائی میں اپنے مکاں سے باہر
میں ساری عمر خواب گراں سے گزری ہوں

کسی نے مجھ کو پڑھا اور نہ شاذیہ دل کو
میں اپنی لکھی ہوئی داستاں سے گزری ہوں

شاذیہ خان
نشاط گنج لکھنؤ
9887984564

اشفاق برادر

مکان نمبر ۱۱۵/۱۳۲، بابو پوروا، کانپور

7499646978

ٹوٹتی قدریں اور چہرے

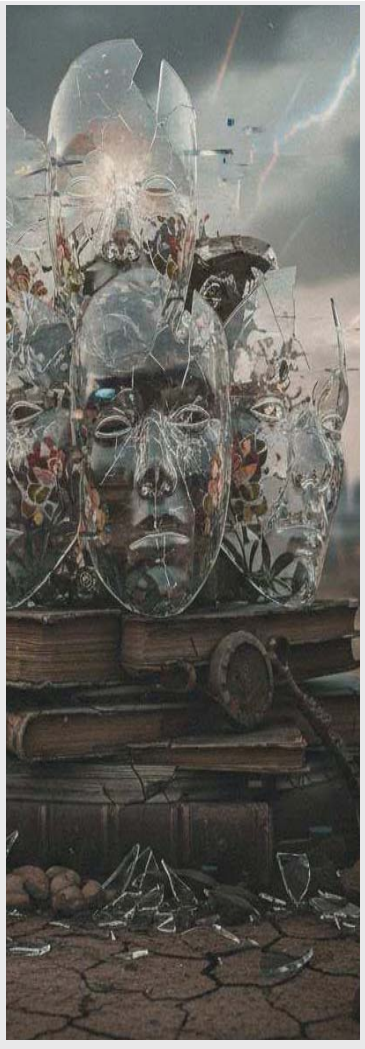

کل رات کائنات مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اب تم اپنے گھر جاؤ، بہت دن رہ لیے۔

لیکن کائنات میں جاؤں تو جاؤں کہاں؟ میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔تم یہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ تمہارا گھر نہیں یہ کہہ کر کائنات زور۔زور سے ہنسنے لگی اور میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔

سنا خالہ جان۔شاہد کا کوئی گھر نہیں ہے اب کچھ دیر کے بعد بولے گا کہ میری بیوی بھی نہیں ہے اور تو اور پھر کہے گا کہ میرا تو بچہ بھی نہیں ہے۔ارے خالہ جان دیکھو تو ذرا شاہد کتنا اچھا ڈرامہ کر رہا ہے۔

ارے کائنات کیوں شاہد کو پریشان کر رہی ہے؟ یہ تو یونہی مصیبتوں کا مارا ہے اس پر تو جان پر بنی ہوئی ہے، تو ادھر آ میرے پاس بیٹھ، دیکھ یہ کپڑے کیسے ہیں؟ خالہ جان قیمتی ہیں لیکن یہ ہیں کس کے لیے؟

کائنات تو تو پوری پاگل ہے اور کس کے ہوں گے شاہد کے ہیں، ہفتوں ہو رہے ہیں بس یہی ایک جوڑا پہنے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے۔

کائنات۔خالہ جان، آپ شاہد کا بہت خیال رکھتی ہیں خالہ جان نے یہ سن کر کائنات کو گھورا۔چل بھاگ میرا تو ایک ہی بھتیجہ ہے شاہد۔کوئی تین چار نہیں۔ارے اللہ تو میری مدد فرما، شاہد کو صحت عطا فرما۔خالہ جان دعا پر دعا مانگے جا رہی تھیں اب تو باقاعدہ ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔

خالہ جان بیتے ہوئے وقت کے خدوخال بٹور رہی تھیں جب وہ دوڑتی بھاگتی ہوئی کام کرنے سے تھکتی نہیں تھیں قرآن کی تلاوت، نمازیں اور صبح وشام روٹیاں بیلنے کا شوق جب کہ پڑھنے کی تلقین ابا جی کرنے سے چوکتے نہیں تھے، گھر کے کام کو دیگر لوگ ہیں کرنے والے، اپنا سبق یاد کرو اور زیادہ بھاگ دوڑ مت کرو۔

لیکن خالہ جان گھر کے سارے کام کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں وہ زمانہ جب لڑکیوں کو چھوٹ نہیں تھی پردے کا اہتمام لیکن کڑھائی، بنائی اور سلائی کا حسن عام تھا گھر کی شان تھا۔خالہ جان کی سچائی اور ہنر کی تعریف گھر کے باہر بھی تھی اللہ نے بہت کمال دیا تھا، صورت وسیرت دونوں میں بھائی میاں کی بیٹی میں۔

معاشرے میں ان باتوں کا بڑا مقام ہوتا تھا۔آج بھی ہے لیکن کافی تبدیلیاں عود آئی ہیں، پیسہ سارے ہنر پر بھاری ہے اور انسان بس اُسی کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے، مرا جا رہا ہے، ہمت، محنت اور جذبے کی قدر تب بھی تھی اور آج بھی۔مگر اب شارٹ کٹ بھی شامل ہے کہتے تو لوگ یہی ہیں کہ دیر پا نہیں ہوتا معاملہ کھل جانے پر بے عزتی اور جگ ہنسائی مگر پھر بھی ذہن چوک نہیں رہے ہیں۔

خالہ جان کبھی بھی اپنوں سے دور نہیں رہیں جبکہ کان بھرائی والی صورتیں ان کے پاس بھی تھیں، لچھے دار باتیں خوشبوؤں سے لبریز، بڑا رس ہوتا ہے اسی گفتگو میں، ہنسی بھی ہوتی اور برے برے منہ بھی بنتے مگر سنتا تو پڑتا ہی ہے، پان کی گلوریاں مگر اب چائے ناشتہ، مسالہ واہ بھئی واہ بہترین استقبال کیا اور یہ دیکھو روپئے بھی دیئے ہیں۔زمانہ بدل رہا ہے مگر خالہ جان آپ کے یہاں آکر اپنی تہذیب یاد آجاتی ہے اللہ آپ کو شاد وآباد رکھے، مجھے تو بہت اچھا لگا۔

خالہ جان کو شاہد میاں کا بچپن یاد آنے لگا جب شاہد ننھے ننھے قدموں سے لپکتا ہوا خالہ جان کی گود میں آنے کو بیتاب رہا کرتا تھا۔ خالہ بڑے پیار سے شاہد کو دلارتی اور اس کے منھ میں خالص شہد بھر دیتیں اور پھر شاہد عجیب انداز میں منھ بناتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگتا تھا۔ ارے پکڑو لڑکیوں کہیں شاہد گر نہ پڑے، اس کو چوٹ لگ سکتی ہے، لڑکیاں ہنستے ہوئے شاہد کو گود میں بھر لیتی پھر شاہد مچلنے لگتا۔ ان کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کرتا۔ اس کے منھ سے شہد نکلنے لگتا اور کپڑے خراب ہونے لگتے تھے پھر لڑکیوں کی شامت آجاتی کہ تم سے ایک بچہ سنبھل نہیں پا رہا ہے جاؤ جا کر شاہد کو دلہن کو دے دو کچھ دیر ڈانٹ ڈپٹ کا ماحول رہتا پھر اس کے بعد ماحول میں خاموشی چھائی رہتی لیکن یہ سب کچھ دیر تک ہی رہتا پھر خالہ جان کی آواز گونجتی۔ کمبختوں، کیا سب کی سب سوگئی ہو، اری ادھر آؤ دیکھو۔ تم لوگوں کے لیے یہ کیا آیا ہے۔ یہ سن کر گھر میں دھما چوکڑی شروع ہو جاتی، خالہ جان دیکھو اس نے پانچ منگوڑے جلدی جلدی کھالیے ہیں میں نے تو تین ہی کھائے ہیں، لڑو مت، ہنسی خوشی بانٹ کر کھالو اور پھر چائے بنالاؤ۔ ان دنوں کی یاد اور آج کے دن، ایسا محسوس ہوتا جب کوئی باغ اُجڑ گیا ہو اللہ کی پناہ۔ شاہد اب گھر میں عربی اور اردو کی تعلیم حاصل کرنے لگا تھا۔ شرارتیں خوب کیا کرتا تھا گھر کی لڑکیاں شاہد کے آگے پیچھے ہوتیں اور کھیلنے، کھلانے میں دن یونہی نکل جایا کرتا تھا۔

شاہد۔ اب باقاعدہ اسکول جانے لگا تھا۔ اس کو پہونچانے اور لے آنے کو ایک نوکر تعینات تھا۔ شاہد پڑھنے لکھنے میں تیز تھا اور اس کا قد اونچا، جلد گوری تھی بلکہ مردانہ حسن چڑھ رہا تھا اس کو جو بھی دیکھتا تو پھر دوبارہ دیکھتا ضرور تھا۔ لیکن شاہد اپنی خوبصورتی سے بے نیاز تعلیم کی دوڑ میں آگے آگے۔ کالج میں داخلہ کیا ہوا کہ شاہد کو اپنی شخصیت کا دھیرے دھیرے احساس ہونے لگا اور پھر پہلے والا شاہد اور آج کے شاہد میں کافی تبدیلیاں بھر اُٹھیں۔ بات کرنے کا لہجہ بدل گیا، شرارت کی جگہ برتری کا احساس جواں ہونے لگا۔ ساتھیوں نے اور سونا پیدا کر دیا یعنی صرف تم اور کوئی نہیں، لڑکیاں پہلے بھی شاہد کے قریب آنے کو بیتاب رہتیں مگر اب شاہد بھی ان میں دلچسپیاں لینے لگا تھا جس طرح کلی کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں بھنورے۔

ان حالات میں شاہد کے جذبات نوجوانی کا اُبھار، پناہ، چھاؤں کی خواہش دھیرے دھیرے دائرہ بڑھاتی گئی اور پھر کساؤ۔ شہد کا میٹھا پن، حسین آغوش میں خود کو گرا دیتا ہے، چند لمحوں کی کشش میں ساری قدریں اڑتی ہوئی دھول کی مانند ہر آنکھ میں چبھنے لگیں، آنکھوں میں لالی اور آنسو موجود تھے اور اس کا اثر خالہ جان کے کانوں تک آخر پہونچ ہی گیا۔ یقین اور نا یقین کے درمیان ڈولتے ہوئے لمحات خالہ جان کو دھار دار لوہے کی چھڑ کی طرح دل و دماغ میں پیوست ہوا تھے، سمجھایا۔ کافی سمجھایا اونچ نیچ بتائی مگر کوئی اثر ہوتا ہوا نہ دیکھ کر مجبوری میں لیلیٰ مجنوں کی شادی کروادی۔ کچھ دنوں تک تو ٹھیک ٹھاک چلتا رہا مگر شاہد کبھی کبھی بیوی کی باتوں پر اعتراض کر بیٹھتا تو پھر قیامت تو نہیں لیکن قیامت کے مناظر رونما ہو جاتے۔ آج ہم کھانا باہر کھائیں گے، نہیں میرے پاس وقت نہیں ہے، صرف میرے لیے وقت نہیں ہے، دیکھو مجھے تنگ مت کرو پھر کسی دن چلتے ہیں، نہیں اسی وقت چلنا ہوگا۔ نہیں تو۔۔۔ شروع ہو گیا ننگ ناچ۔۔ اللہ کی پناہ، منھ پر انگلیاں اور چہروں پر حیرت یہ کیسی بہو ہے؟ جس کو ذرا بھی شرم وحیا نہیں، زبان تو دیکھو کیسا چلا رہی ہے؟ مختلف منھ اور باتیں، اُس پر طرہ یہ کہ ہم میاں بیوی کے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔

❑❑❑

غزل

جب تک پھلی ہوئی کوئی شاخِ ثمر نہ تھی
ہوتی ہے سنگ باری بھی مجھ کو خبر نہ تھی

اس کی نگاہِ شوق نے اخبار کر دیا
اہل جہاں کی کیا، مجھے اپنی خبر نہ تھی

منزل پہ آگئی ہوں تو دنیا ہے میرے ساتھ
کل تک تو میری ذات، مری ہم سفر نہ تھی

خونِ جگر جلا کے وہ کرتے ہیں روشنی
شب تاب کو نصیب نمودِ سحر نہ تھی

اس کی ستم نوازی کا احساس ہے مجھے
تھی جس طرف نگاہ توجہ ادھر نہ تھی

اس آستانِ شوق کی اب ہم ہیں آبرو
جس آستانِ شوق میں، اپنی گزر نہ تھی

شاید یہ اپنا اپنا مقدر ہے اے فرات
کوثرؔ ہوس پرستوں کے زیر اثر نہ تھی

کوثر پروین کوثرؔ
ٹوبی، کمبر اسٹریٹ، سکینڈ فلور، کولکاتہ
9339784378

ڈاکٹر ریاض توحیدی
وادی پورہ، ہندواڑہ، کشمیر
9906834877

ایکٹو لائف

ڈکسن پریشانی کے گرداب میں پھنس چکا تھا۔اس کی نظر جب بیوی کے مایوس چہرے پر پڑتی تو اسے اپنی زندگی تاریک بنتی دکھائی دیتی۔ڈکسن بنیادی طور پر ڈنمارک کا باشندہ تھا۔ڈنمارک قدرتی چراگاہوں اور اینمل فارمز کے لئے مشہور ہے۔اس کے خاندان کا بھی ایک بڑا اینمل فارم تھا۔ڈکسن نے ایم۔بی۔اے کرنے کے بعد پولٹری فارم کھولنے کا من بنالیا' تاہم وہ روایتی انداز کے پولٹری فارم چلانے کے برعکس سائنسی انداز کا جدید قسم کا پولٹری فارم کھولنا چاہتا تھا۔ایک دن جب اس نے اس تعلق سے اپنے ایک دوست سے پوچھا تو اس نے پولٹری فارم کا سرٹیفکیٹ کورس کرنے کا مشورہ دے دیا۔یہ مشورہ اسے پسند آیا۔گھر والوں سے مشورہ کرکے اس نے شہر کے ہی ایک ادارے میں داخلہ کروایا اور ایک برس کا کورس بھی مکمل کرلیا۔چند مہینے فارم کھولنے کے بنیادی لوازمات پر غور کرتا رہا اور شہر کے کئی بڑے بڑے پولٹری فارمز کو بھی دیکھتا رہا۔وہ چاہتا تھا کہ وہ جب کام شروع کرے گا تو اس کا فارم ہر قسم کی جدید سہولیات سے آراستہ ہو۔

ایک دن وہ گوگل پر کچھ تلاش کررہا تھا تو وہاں پر ایک ٹراول ایجنسی کا اشتہار سامنے آیا جس میں انڈیا کی سیر وتفریح کے لئے جانے کی تفصیل بتادی گئی تھی۔پتہ نہیں اشتہار دیکھ کر اس کے دل میں کیوں انڈیا گھومنے کا خیال آیا۔اس نے ہلپ لائن پر ڈائل کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے تک جانکاری لیتا رہا اور پھر چند ہفتوں کے اندر اندر سبھی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد وہ تین مہینے کی سیر وتفریح کے لئے انڈیا پہنچ گیا۔یہاں پہنچ کر وہ کئی مشہور شہروں' کئی یونیورسٹیوں اور تاریخی وسیاحتی مقامات کی سیر سے بہت محظوظ ہوا۔

ایک دفعہ وہ کسی انگریزی میگزین کا مطالعہ کررہا تھا تو وہ یہ پڑھ کر حیران ہوا کہ کیرلا کو دنیا کے اہم سیاحتی مقامات میں شمار کیا جاتا ہے۔بس پھر کیا ایک دو دن کے بعد دہلی سے کیرلا دیکھنے کے لئے چلا گیا۔چونکہ کیرلا کی کچھ جگہوں پر زیادہ ہی انگریزی کلچر کا اثر ہے اس لئے اسے کچھ زیادہ ہی لطف آیا۔

ایک دن وہ ایگریکلچر یونیورسٹی پہنچا۔یونیورسٹی گھومنے کے بعد وہ پولٹری فارم سیکشن چلا گیا۔وہاں پر اس نے سیکشن کے ہیڈ سے ملنے کے بارے میں ایک لڑکی سے پوچھا۔لڑکی انگریزی حلیہ دیکھ کر خوش ہوئی اور اس کو سیکشن ہیڈ کے چیمبر میں لے کر واپس نکل گئی۔سیکشن ہیڈ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوا اور ہاتھ ملا کر بیٹھنے کو کہا۔متعارف ہونے کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں ملکوں کے بارے میں گفتگو ہوئی اور اس نے انڈیا کی سیر سے محظوظ ہونے کا بھی بتایا' اپنی ڈگری اور پولٹری فارم سے دلچسپی کا اظہار بھی کیا اور وہاں کے پولٹری فارم دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تو سیکشن ہیڈ جو کہ خود بھی اسی سبجیکٹ کا ماہر تھا' نے خوش ہوکر اسے یونیورسٹی کے پولٹری فارمز دیکھنے کی اجازت دے دی بلکہ خود بھی ساتھ چلا گیا۔

ایک دو گھنٹے کے بعد دونوں چیمبر میں لوٹ آئے۔اس کے بعد چائے کا دور چلا اور ڈکسن نے جب اپنے پولٹری فارم کے کورس کا بتایا تو ہیڈ صاحب بہت خوش ہوئے اور اسے طلبہ کو توسیعی خطبہ دینے کی گزارش بھی کی اور ساتھ ہی یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس میں چند دنوں کے لئے بطور مہمان ٹھہرنے کا مشورہ بھی دیا۔ڈکسن یہ غیر متوقع بات سن کر خوش ہوا۔دو تین دن تک وہ طلبہ کو لیکچر دیتا رہا اور طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی متاثر ہوتے گئے۔جس لڑکی نے اسے ہیڈ کے چیمبر میں چھوڑا تھا وہ بھی اسی شعبے

میں زیر تعلیم تھی اور ان دنوں لیکچر کے بعد وہ اس سے ملتی بھی رہی اور سبجیکٹ کے بارے میں سوالات پوچھتی رہی۔ڈکسن کو بھی یہ بات پسند آتی گئی اور آخری دن وہ یہ جان کر اور بھی خوش ہوا کہ یہ لڑکی بھی کرسچن ہے اور کشمیر کی رہنے والی ہے۔ان کا گھر سرینگر میں ہے اور نام لوسی ہے۔آخری ملاقات کے وقت سیکشن ہیڈ نے بتایا کہ وہ وی۔سی صاحب سے بات کریں گے اور آپ کو چند مہینوں کے لئے کنٹریکٹ لیول پر لیکچرر دینے کے لئے بلائیں گے۔اگر منظوری ملی تو وہ یونیورسٹی سے آفیشل لیٹر بھی سینڈ کروائے گا تاکہ آپ کو یہاں آنے میں آسانی ہوگی۔ڈکسن نے بھی رضامندی ظاہر کی اور اپنا مکمل پتہ اور دیگر ضروری معلومات کاغذ پر لکھ کر شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

چند مہینوں کے بعد ڈکسن کو یونیورسٹی سے اجازت نامہ مل گیا اور وہ گھر والوں سے مشورہ کر کے کیرلا واپس لوٹا۔یہ کنٹریکٹ ایک سال کا تھا اور یونیورسٹی کی طرف سے گیسٹ ہاوس میں طعام وقیام کا انتظام بھی ہوا تھا۔

اس کے ذمہ ایک تو طلبہ کو لیکچر دینا تھا اور ساتھ ہی پولٹری فارم کو جدید سہولیات کے تحت چلانے کا پروجیکٹ بھی تھا۔وہ دونوں کام بحسن خوبی انجام دیتا رہا۔چونکہ طالب علموں میں چند ہی کرسچن تھے۔باقی زیادہ تر ہندو اور مسلمان تھے۔لیکن اس کے لیکچر سبھی کو پسند آتے تھے اور ہر کوئی اس سے ملتا جلتا رہتا۔لوسی بھی چونکہ اسی شعبے کی طالبہ تھی اور پہلے دن تو اسی سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے وہ بلاتکلف اس کے ساتھ بات چیت کرتی رہتی۔لوسی وہاں پر انکل کے گھر رہتی تھی۔

اس کا انکل بھی ایک یونیورسٹی میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔اس لئے دو تین مہینوں کے بعد ڈکسن کا آنا جانا لوسی کے انکل کے گھر شروع ہوگیا۔لوسی کے انکل نے ڈکسن کی قابلیت اور اخلاق دیکھ کر ایک دو بار کہا بھی کہ وہ گیسٹ ہاوس کے بجائے ان کے گھر میں بھی رہا کرے لیکن ڈکسن ہمیشہ شکریہ کہتے ہوئے معذرت کرتا رہا۔

لوسی اردو بھی جانتی تھی اور ایک دو انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کر چکی تھی۔ایک دن ایک اردو کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھ کر ڈکسن نے پوچھا کہ یہ کونسی کتاب ہے؟ تو اس نے بتایا یہ اردو کی کتاب ہے۔آپ نہیں پڑھ سکتے۔یہ سن کر ڈکسن مسکرایا اور تھوڑے وقفے کے بعد کہا کہ آج سے آپ مجھے اردو سکھائی گی۔یہ سن کر لوسی مسکرائی اور اس کو مذاق ہی سمجھا لیکن دوسرے دن وہ حیران ہوئی جب اس کے انکل کے گھر آ کر ڈکسن نے کہا کہ وہ آج سے ہی اردو سیکھے گا۔اس طرح یہ سلسلہ شروع ہوا اور دو چار مہینوں کے بعد ڈکسن کچھ حد تک اردو سمجھنے بھی لگا تھا' پڑھنا بھی اور تھوڑا بہت لکھنا بھی۔

اب یہ دونوں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی باتیں کرتے رہتے اور لوسی اس کے تلفظ پر خوب ہنستی تھی۔رفتہ رفتہ دونوں کے دلوں میں محبت جگہ بنا گئی اور ایک دن ڈکسن نے لوسی سے مشورہ کر کے انکل سے رشتے کی بات بھی چھیڑی۔انکل نے یہ سن کر کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں کیا لیکن لوسی کے والدین کی رضامندی کی شرط رکھی جو کہ کشمیر میں تھے۔

ایک دو مہینوں کے بعد انکل نے پُرمسرت لہجے میں کہا کہ لوسی کے والدین رشتہ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔تاہم لوسی ان کی اکلوتی اولاد ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ آپ کو کشمیر میں ہی رہنا ہوگا اور مجھے آپ کے گھر جا کر آپ کے والدین سے ملنا ہوگا' اسی بہانے ڈنمارک کی سیر بھی ہوگی۔ڈکسن یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہا اور پھر بولا کہ وہ کچھ دنوں کے بعد بتائے گا۔

دو چار دن ڈکسن اس بارے میں سوچتا رہا اور پھر کئی دنوں تک فون پر گھر والوں سے بھی مشورہ کرتا رہا۔چونکہ اس کے اور بھی دو تین بہن بھائی تھے اس لئے گھر والوں نے بھی اجازت دے دی اور پھر اس نے پہلے لوسی کو یہ خوشخبری سنائی اور اس کے بعد اس کے انکل کو۔

ایک دن ڈکسن انکل کے گھر میں تھا تو اس نے لوسی کو وہ اردو کتاب لانے کے لئے کہا۔انکل بھی گھر میں موجود تھا۔لوسی نے کتاب لا کر جب اس کے ہاتھوں میں تھمادی۔ کتاب کا نام تھا 'خدا اور کائنات'۔نام دیکھ کر ڈکسن مسکرایا اور کہا:

''کیا یہ گاڈ (خدا) سے متعلق ہے؟''

''ہاں۔یہ خدا اور کائنات یعنی یونیورس سے متعلق ہے۔''لوسی نے خوش ہو کر کہا۔''جو ساری کائنات کا مالک ہے۔''

''اچھا۔۔۔''ڈکسن دوبارہ مسکرایا اور پوچھا''تو آپ بھی خدا پر یقین رکھتی ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔''لوسی بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں نے کبھی بھی اس بات کو سیریس نہیں لیا۔''ڈکسن کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

چونکہ انکل بھی وہاں پر موجود تھا تو وہ یہ سن کر تھوڑا سا حیران ہوا لیکن بڑے مہذبانہ انداز سے بولا:

''بیٹا۔۔۔آج کل کے کئی لوگ اس بات کو سیریس نہیں لیتے ہیں لیکن کائنات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا موجود ہے۔''

یہ سن کر ڈکسن نے بس اتنا ہی کہا کہ میں نے کبھی بھی اس بات کو سیریس نہیں لیا اور نہ کبھی اس بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اس کے باوجود ڈکسن کتاب کا مطالعہ کرتا رہا اور جہاں پر سمجھنے میں مشکل درآتی تو وہ انکل یا لوسی سے پوچھتا رہتا۔

ڈکسن کا کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد انکل اور لوسی دونوں اس کے ساتھ ڈنمارک چلے گئے۔ڈکسن کے گھر والوں نے ان کا اچھا استقبال کیا۔دس بیس دن تک انہوں نے ڈنمارک کی کئی جگہوں کی سیر کی اور وہاں کی ترقی سے حیران بھی ہوئے۔

واپس لوٹ کر اب سبھی لوگ رشتہ جوڑنے پر آمادہ ہوئے۔

ایک سال تک قانونی دستاویزات کی کاروائی مکمل ہوگئی اور تب تک لوسی نے بھی ڈگری حاصل کی۔ڈکسن گھر کے کئی افراد کے ساتھ ڈنمارک سے کیرلا چلا آیا اور پھر دونوں کی شادی کیرلا میں ہی انکل کے گھر انجام دی گئی۔چند مہینوں کے بعد دونوں کشمیر چلے آئے۔ایک دو سال تک ڈکسن پولٹری فارم کھولنے کی تیاری کرتا رہا۔

لوسی کو بھی ایک نجی کمپنی میں جاب مل گئی۔لوسی کے والدین بھی اچھے سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔اس لئے پولٹری فارم کھولنے میں کوئی مالی مشکلات درپیش نہیں آئی۔چونکہ لوسی کی خاندانی زمین بھی کافی تھی اس لئے زمین کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔پولٹری فارم جدید سہولیات سے مزین تھا۔یہ لوسی کے نام پر ہی کھولا گیا تھا۔کام بھی اچھا چل پڑا۔ویسے بھی ڈکسن

کا دل کشمیر کے خوبصورت مناظر نے موہ لے لیا تھا۔

اس لئے اس کو اطمینان تھا کہ اس کا فیصلہ ٹھیک ہی رہا۔ اکثر و بیشتر دونوں میاں بیوی شام کے وقت نشاط، شالیمار اور ہارون گارڈن سیر کو جاتے تھے۔ چونکہ یہ ان کے لئے آسان بھی تھا کیونکہ ان کی رہائش بھی شہر میں ہی تھی۔ کبھی کبھار ڈل کی سیر بھی کرتے تھے۔ لوسی اکثر چرچ بھی جاتی تھی اور ڈکسن کو بھی کہتی رہتی لیکن وہ بس کبھی کبھار اس کا دل رکھنے کے لئے چرچ چلا جاتا۔ زندگی یونہی آگے بڑھتی رہی اور وہ دونوں بھی زندگی کے بہترین ہم سفر ثابت ہوتے گئے۔

ڈکسن کو کبھی کبھار لوسی کے ساتھ ایک مقامی کلینک تک بھی جانا پڑتا تھا۔ یہ شہر کا مشہور کلینک تھا جس کو ڈاکٹر مشتاق چلاتا تھا۔ اب ڈکسن اور ڈاکٹر مشتاق کی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ ایک کامیاب بزنس مین ہونے کے باوجود ڈکسن کو اندر ہی اندر ایک پریشانی کھائے جا رہی تھی کیونکہ طبی طور پر لوسی بچہ جننے کی صلاحیت سے قاصر تھی۔ ڈاکٹر مشتاق سے بھی اس مسئلے پر کئی بار صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ وہ بار بار کہتا کہ ہم تو علاج کرتے رہتے ہیں، باقی خدا سے بھی دعا مانگا کریں۔ خدا اور دعا کا نام سنتے ہی ڈکسن بات ٹالتا رہتا۔ کئی بار جب لوسی نے یہ دیکھا تو وہ ڈکسن سے کہتی رہتی کہ آپ خدا کے ہونے پر کیوں ہچکچاتے رہتے ہیں۔ ڈکسن بس یہی جواب دیتا کہ میری عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں کہ عقل کے استعمال سے ہی میں نے اتنا کام بڑھایا ہے اور کامیاب بھی ہوا اور اس کے بعد وہ لوسی کو فریڈرک نطشے کا فلسفہ ''خدا کی موت'' اور دوسرے ملحد فلسفیوں کے نظریات سناتا رہتا۔ اس موضوع پر دونوں کے درمیان اکثر بحث وتکرار ہوتی رہتی۔ ایک دفعہ دوران بحث ڈکسن نے پوچھا کہ آپ کہتی ہیں کہ کائنات خدا نے بنائی ہے تو اس سے پہلے کیا تھا؟ یہ سن کر لوسی نے غالب کا مصرع سنایا:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈکسن یہ مصرع سن کر بولا کہ یہ کس نے کہا ہے؟

''غالبؔ نے۔۔۔''

یہ غالبؔ کون ہیں؟

''غالبؔ اردو کے مشہور شاعر ہیں۔''

یہ سن کر ڈکسن نے مزید کچھ نہیں کہا۔

کچھ عرصے کے بعد ڈکسن نے ہیچری فارم کھولنے کا پروگرام بنایا۔ لوسی سے مشورہ کر کے وہ کیرلا چلا گیا اور لوسی کے انکل کو فارم کی پوری جانکاری دے دی۔ پھر وہ لوسی کو ساتھ لیکر کیرلا چلا گیا۔ ہیچری فارم بن جانے کے بعد کام بھی ٹھیک طرح سے چلتا رہا۔ ایک دن وہ ہیچری فارم میں چوزے تخلیق ہونے کے مصنوعی طریقہ کار پر سوچ رہا تھا کہ اس کے ذہن کو ایک خیال سے جھٹکا سا لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد یہی خیال اس پر خوشگوار کیفیت طاری کر گیا۔ ایک دفعہ اس نے لوسی کے پروفیسر انکل کو اپنے خیال سے آگاہ کیا۔ انکل اس کی بات سن کر تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس کی ڈھارس باندھتے ہوئے بولا:

"ڈکسن۔۔۔ آپ کی پریشانی کا ایک حل ہے اگر آپ لوگ اس کے لئے تیار ہونگے۔"

یہ سنتے ہی ڈکسن کے اندر جیسے نئی جان سی آگئی۔ اس نے خوش ہو کر انکل کی رائے جاننا چاہی:

"انکل۔۔۔ آپ بتائیں' میں اس بات پر ضرور غور کرونگا۔"

''میرا ایک دوست انگلینڈ میں رہتا ہے۔ وہ کافی مشہور ڈاکٹر ہے اور ایسے مسائل کو حل کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ ایک دو برس قبل میں جب انگلینڈ چلا گیا تو اس کے ہاں ہی قیام کیا تھا تب اس نے اس بارے میں کئی بار بتایا تھا۔''

انکل کی بات سن کر ڈکسن نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور دونوں نے انگلینڈ جانے کی تیاری کی۔ ایک سال کے بعد دونوں میاں بیوی انگلینڈ سے خوش ہو کر واپس گھر لوٹے۔ اپنے بچے کو دیکھ کر ڈکسن پھولے نہیں سماتا تھا۔ چند برسوں کے بعد اس نے سوچا کہ جو خوشی انہیں ملی ہے وہ ایسے ہی دوسرے لوگوں کو ملنی چاہیے اور مستقبل میں یہ بزنس خوب چل سکتا ہے۔ اس تعلق سے کئی بار انگلینڈ کے ڈاکٹر سے صلح مشورہ ہوتا رہا اور وہاں سے ہی ماہرین کی ایک ٹیم بلوا کر جدید تیکنالوجی سے لیس ایک فارم بنایا گیا۔ جس کا نام ڈکسن نے اپنے لڑکے کے نام پر جیمس ایکٹو لائف فارم رکھا۔ یہ فارم بھی رفتہ رفتہ کامیاب ہوتا گیا۔ ڈکسن دونوں فارموں کی نگرانی خود کرتا تھا اگرچہ کئی لوگ ان میں کام بھی کرتے رہتے تھے۔ اور وہ اپنی کامیابی پر ہمیشہ فخر کرتا رہتا۔

تاہم۔۔۔ اتنی کامیابی کے باوجود ڈکسن' ہمیشہ ایکٹو لائف فارم کے بچوں اور ہیچری فارم کے چوزوں کے درمیان امتیاز کرتے وقت ہمیشہ فطری مسکراہٹ کا متلاشی نظر آتا تھا۔ اسے یہ بچے جیسے چلتے پھرتے روبوٹ لگتے تھے اور تخلیق کائنات پر غور کرتے ہوئے اسے اپنا وجود خدا کا شاہکار لگتا تھا۔

❑❑❑

لکھنؤ ایجنسی

ماہ نامہ ''نیا دور'' کے وہ قارئین جو اس کے مستقل ممبر نہیں ہیں اگر وہ نیا دور کی خریداری کے خواستگار ہیں تو لکھنؤ میں ان مندرجہ ذیل ایجنسیوں سے رابطہ کریں۔

دانش محل:

امین آباد لکھنؤ۔ 9792361533

عرش پبلیکیشنز:

خواجہ ٹاور، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ۔ 9935915110

افضل ممتاز

داؤدسرائے،امروہہ

9012987620

پہچان

میں اور احان ایک محلے سے گزر رہے تھے جو پکی سڑک سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اچانک احان رُک گیا اور سامنے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تمام مکان شکستہ ہو چکے تھے، بس انکی آخری دیوار سلامت تھی جو پرانے بھڑکیلے مکان کی دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک بوسیدہ گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احان نے کہا:

"دیکھ رہے ہو؟ چند روز پہلے یہاں باقاعدہ مکان ہوا کرتے تھے۔ اور یہ جو سامنے دکھائی دے رہا ہے..... یہ اسی مزدور کا مکان ہے جس نے اپنے گھر مزدوری کی تھی..... جب اپنا گھر بنا تھا۔" مجھے بالکل بھی خبر نہیں تھی کہ احان کس مزدور کی بات کر رہا ہے اور مجھے آخر اس بات سے مطلب بھی کیوں ہوتا؟ اگر اسنے ہمارے یہاں کام بھی کیا تو کیا ہوا؟ ہم نے تو اسکی مزدوری ادا کر دی اسکے بعد ہمارا اس سے کیا واسطہ؟ میں نے قدموں تلے پڑے اینٹ کے ٹکڑے کو ٹھوکر مارتے ہوئے بے پروا لہجے میں کہا: "مجھے کچھ یاد نہیں۔" احان نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا: "ارے! وہ پکے رنگ کا، سر پہ رمال باندھتا تھا، ہٹا-کٹا، لمبا-لمبا، ہر دم خیالات میں کھویا رہتا، مسکراتا رہتا۔" میں سمجھ چکا تھا احان کس کی بات کر رہا ہے بڑا عجیب انسان تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے مذاق بھی کیا تھا، نیک دل کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا میں نے احان کی طرف دیکھا: "جاوید؟ عجیب آدمی تھا وہ۔" "ہاں" "تو کیا ہوا؟" "بے چارہ! اس کا باپ بھی مزدور تھا"، احان نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔ مگر مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں بولا: "بھئی! مزدور کے باپ کا مزدور ہونا ہی تو ممکن ہے، نہیں تو کیا وہ کسی سرکاری دفتر میں افسر ہوگا؟ اور پھر کس سرکاری ملازم کو منظور ہوگا کہ اس کا بیٹا مزدوری کرے، وہ بھی اس طرح کی؟ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے، کیسی بے تکی باتیں کر رہا ہے؟"

میں ابھی خاموش بھی نہ ہوا تھا کہ احان نے بڑے خشک لہجے میں کہا: "ہاں، مزدور تھا..... مگر ایسا مزدور جسے دنیا اور دنیا داری سے کچھ سروکار نہ تھا۔ بس کمانا اور کھانا۔ لیکن پھر بھی، اس کے باپ نے بڑی محنت اور ریاضت سے کچھ پیسے جمع کر کے یہ زمین خریدی تھی۔ اسی پر ایک کچا سا مکان بنایا اور پوری زندگی اسی میں گزار دی..... اولاد پیدا کی لیکن اس کے لئے کیا کرنا ہے کچھ خبر نہیں۔" احان کی یہ آخری بات میرے مطلب کی تھی۔ میں نے حسبِ معمول ہنستے ہوئے کہا: "بھئی! ہمارے دیش میں بچے تو مذاق-مذاق میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی عورتوں کو تکلیف نہیں ہوتی کیا؟ تین چار برس میں تین چار بچے جن دیتی ہیں۔ اتنی طاقت آخر لاتی کہاں سے ہیں؟ میں نے تو خود دیکھا ہے، ابھی خود کھیلنے کی عمر میں ہوتی ہیں اور بچے پال رہی ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایسے نہیں، ایک گود میں، ایک پیٹ میں!" میں یہ کہہ کر زور سے ہنسنے لگا، مگر احان کو میری بات پر ذرہ برابر بھی ہنسی نہ آئی۔ اس نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے نامناسب الفاظ کہہ دیے تھے۔ میں نے نادانی بھرے لہجے میں اس سے پوچھا: "ویسے، اپنے جاوید صاحب کتنے بھائی بہن تھے؟" "میرے چھوٹے بھائی نے مجھے اُس نگاہ سے دیکھا، جس نگاہ سے اکثر ہمارے پتاجی مجھے دیکھا کرتے ہیں۔ پھر بڑی محبت اور سنجیدگی سے بولا: "صرف ایک..... جاوید اکیلا ہی تھا۔ ایک شام اس کے ابا کام سے گھر واپس آ رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آ گئے۔ یہ دل دہلا دینے والا حادثہ تھا، ان کی روح وہیں پرواز کر گئی۔ آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ٹرک کس کا تھا۔ غریب کو زندگی کی طرح موت بھی بھگوان سخت ہی دیتا ہے، امیروں کے پاس تو موت بھی احترام سے آتی ہے۔"

میں سوچ میں تھا کہ احان نے یہ کیا کہہ دیا کہ تبھی اس نے گہری سانس بھری اور کہا: "بے چارے....." یہ بات میں کہنا نہیں چاہتا، مگر حقیقت یہی ہے کہ احان اگرچہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے، لیکن بہت سی باتوں میں مجھ سے بڑا ہے، انسانیت میں مجھ سے بڑا ہے، ہر ایک کا خیال رکھتا ہے، آداب و اخلاق میں مجھ سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ میں تو بچپن سے ہی شرارتی رہا ہوں،

جبکہ احان ابتدا ہی سے بااخلاق اور سنجیدہ طبیعت کا مالک ہے۔ میرے اور اس کے مزاج میں ابدی تضاد پایا جاتا ہے۔ میری عادتیں تو بچپن ہی سے بگڑی ہوئی تھیں، کہتے ہیں نہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی دیکھ جاتے ہے۔ شاید میرے ماں باپ کو بھی میرے پیدا ہوتے ہی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں بڑا ہو کر کیسا نکلوں گا، اسی لیے شاید انہوں نے میرا نام آرین رکھا۔ میں کچھ کہہ پاتا کہ احان نے کہا: "باپ کے مرجانے کے بعد اولاد پر جو مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں، انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے والد کے انتقال کے بعد اُس کی ماں ہمیشہ افسردہ رہنے لگی۔ وہ پہلے ہی بیمار تھی، اب مزید کمزور اور ناتواں ہوگئی۔ بڑھیا کو یقین ہو چلا تھا کہ اُس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں، اس لیے اس نے اپنی آخری خواہش اپنے بیٹے کے سامنے ظاہر کی۔" مجھے پرانی داستانیں بہت پسند ہیں جس میں مرنے والا اپنے آخری الفاظ ادا کرتا ہے ان الفاظ میں کسی خزانے کا پتا چھپا ہوتا ہے میں نے احان سے بے ساختہ معلوم کیا: "کیا؟"۔۔۔ کیا بتایا اس نے؟" "بھائی! آپ خاموشی سے سنیے، میں سب بتاتا ہوں۔" میں فوراً خاموش ہوگیا۔ احان نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

"بڑھیا نے جاوید کو اپنی آخری خواہش بتائی کہ وہ مرنے سے پہلے اُس کی شادی دیکھنا چاہتی ہے، اور کسی پوتے یا پوتی کا چہرہ دیکھ کر دنیا سے رخصت ہونا چاہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" بھائی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے یہاں لوگوں کی سوچ ایسی کیوں ہے۔ ان کی ساری خواہشوں کا محور یہی ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے پوتا یا پوتی دیکھ لیں۔ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ مرنے سے پہلے اپنی آخرت سنوار لیں۔ شادی تو انسان جب چاہے کر سکتا ہے، مگر اپنے وقت کو جب چاہے بدل لے، یہ ممکن نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی جب چاہے اندھیروں سے نکل کر اجالے میں آجائے۔ اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے، اور وہ وقت بہت مختصر ہوتا ہے۔ اگر انسان طویل عرصہ اندھیرے میں گزار دے تو اجالا اسے راس نہیں آتا، کیونکہ اُس کی آنکھیں روشنی کی عادی نہیں رہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمزور قومیں اور کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں، یہاں اولاد بعد میں پیدا ہوتی ہے، اس کی شادی کا سوچ پہلے لیا جاتا ہے۔ اور چاہے وہ اس کے لائق ہو یا نہ ہو، شادی کرادی جاتی ہے۔ پھر وہ بچہ بھی وہی کرتا ہے جو اُس کے ساتھ ہوا ہوتا ہے، حالانکہ انسان کا کام یہ ہے کہ ایک نسل کو دوسری نسل سے بہتر بنا کر جائے۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن جاوید ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ "میں ایسے گھر میں شادی نہیں کروں گا۔ پہلے گھر بناؤں گا۔ یہاں سب کے گھر بنے ہیں، بس اپنا ہی ایسا ہے۔

"اسکی ماں نے اسے سمجھتے ہوئے کہا: بیٹا! ان کی کمائی بھی تو ہم سے زیادہ ہیں۔" تو کیا ہوا میں بھی دن رات کماؤں گا اور پہلے گھر بناؤں گا۔" جاوید اب دن رات کماتا اور روپے اکٹھے کرتا اسکی ماں نے بھی دوگنی محنت سے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور ایک مہینے کے اندر اندر جاوید کی بات پکی کر دی اسکی ماں کو پڑوس کے محلے کی ایک لڑکی بہت پسند آئی لڑکی خوبصورت تھی گھر کا کام کاج بھی سب جانتی تھی۔ لڑکی والوں کو جاوید بھی پسند آگیا۔ جاوید نے ایک سال کے اندر اندر اپنا گھر بنالیا، جاوید جب اپنے گھر کو دیکھتا تو اسکی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا گھر بھلے ہی ایک کمرے کا تھا مگر اسکے لئے تو اسکا وجود تھا۔ نمبر کے ماہ میں شادی کی تاریخ تے کی گئی۔ جاوید نے بڑے اہتمام سے اپنے کمرے کو سجانا شروع کیا۔ وہ بازار سے نئی نئی چیزیں خرید کر لاتا اور انہیں نہایت سلیقے سے اپنے کمرے میں سجا دیتا، جس سے کمرے کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے۔ شادی میں بیس دن باقی تھے کہ جاوید کی ماں کا انتکال ہوگیا۔ جاوید کو اتنا دکھ اپنے باپ کے مرنے کا نہ ہوا جتنا دکھ اسے ماں کے مرنے کا ہوا۔ بڑھیا کا خواب ادھورا اسکے ساتھ کفن میں لپٹا چلا گیا۔ جاوید کو اب طرح طرح کے خیال پریشان کرنے لگے اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے، شادی کے لئے جو پیسے جمع کئے تھے وہ سب تو کفن، دفن اور فاتحہ میں ہی ختم ہوگیے۔ جاوید اکیلا کمرے میں لیٹا چھت کو گھورتا رہتا۔ جو چیزیں کبھی اس کمرے کی رونق بڑھاتی تھیں، اب وہی چیزیں اسے اپنی بے بسی کا مذاق اُڑاتی محسوس ہوتیں، اور وہ ان سب سے نفرت کرنے لگا تھا۔

جاوید کو تنہائی ڈسنے لگی تھی۔ اسنے سوچا کہ اسے خودکشی کر لینی چاہئے اب اسکا اس جہاں میں بچا ہی کیا ہے کہ تبھی جاوید کو اس لڑکی کا خیال آیا۔ اسکے دل پہ کیا گزریں گی؟ اسنے بھی تو میری طرح بہت سے خواب سجائے ہونگے؟ میں نے تو صرف اسکے لئے یہ ایک کمرے کا گھر بنایا ہے اسنے تو خیالات کی پوری دنیا سجائی ہوگی۔ اسنے لاکھوں خواب دیکھے ہونگے۔ جو حقیقت ہونے کا انتظار کر رہے ہونگے۔ جاوید نے سوچا جو ہوا ہے، خدا کی مرضی سے ہوا ہے۔ اس غم کو بھول کر جاوید نے اپنی زندگی میں آگے کدم رکھنا چاہا، اس نے شادی کرنی چاہی۔ جس کے دن آگے بڑھا دیئے گئے تھے۔

اب جاوید دن بھر کام پر رہتا جب شام کو گھر آتا تو کئی خواب دیکھتا۔ جیسے اسکی شادی ہو جائیگی تو، جب وہ شام کو گھر آئیگا اسکی بیوی اس کے انتظار میں ہوگی، اسے پیار سے کھانا کھلائیں گی، وہ اپنی بیوی سے پیار کی باتیں کریں گا اسے زمانے کی ہر خوشی دیگا۔ انہیں خیالات میں ڈوبا جاوید شام کو کام سے تھک ہار کر آنے کے بعد گھر کا سارا کام کرتا، اپنے لئے کھانا بناتا اور پھر اپنے کمرے میں انہی حسین خیالات کے سائے میں سو جاتا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اسکے لئے ایک دنیا تھی۔ اسے یہ کمرہ جنت سے بھی پیارا لگتا، جو بیوی کے آجانے سے آباد ہونے والا تھا۔ ایک صبح، جب جاوید کام پر جانے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے پر ایک سرکاری ملازم نے دستک دے دی۔ جاوید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مؤدبانہ انداز میں کہا: "سلام ساب!" اس سرکاری ملازم نے سلام کے جواب میں کہا: "یہ تمہارا گھر ہیں؟" "ہاں ساب" "یہ اویدھ جگہ میں بنا ہوا ہے اسے خالی کرو یہ سرکاری زمین ہے۔" جاوید کی سانس اٹک گئی۔ وہ گھبرا کر بولا: "س۔۔۔س۔۔۔سرکاری زمین ساب!" "ہاں، یہ دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے جاوید کے ہاتھ میں نوٹس تھما دیا۔ جاوید گھبرا کر بولا، "یہ..... یہ کیا ہے؟" سرکاری ملازم نے سخت لہجے میں کہا، "پڑھ لو۔" جاوید سے کچھ پڑھنا آتا تو کچھ کہتا۔ وہ بت بنا ہوا بس دیکھتا رہا۔ جاوید بھول گیا کہ اسے کام پر بھی جانا ہے۔ وہ سیدھا محلے کے پڑھے لکھے لوگوں کے پاس پہنچا۔ وہاں اسے بتایا گیا کہ اگر زمین کے کوئی کاغذات ہوں تو لے آئے، تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ یہ زمین واقعی اُس کے باپ نے خریدی تھی۔ جاوید گھر واپس جا کر ہر جگہ تلاش کرنے لگا، مگر اسے کوئی کاغذ نہ ملا۔ وہ بے حد گھبرایا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بدحواسی کے عالم میں اس نے سوچا کہ اپنے باپ سے معلوم کرے کہ زمین اس نے خریدی تھی تو اس کے کاغذات کہاں ہیں۔ جاوید سیدھا قبرستان کی طرف چل دیا، اسے کون سمجھائے کہ قبر سے آواز نہیں آتی، وہ کہاں جا رہا ہے۔ جب جاوید قبرستان پہنچا اور اپنے والد کی قبر دیکھی تو حیران رہ گیا، بالکل خاموش۔ والد کی قبر سے کچھ فاصلے پر اس کی والدہ کی قبر تھی۔ ماں کی قبر کے پاس گیا تو وہاں بھی یہی منظر، مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس نے اس پاس کی قبروں کو دیکھا تو ان پر کچھ نہ کچھ تحریر موجود تھی۔ ان تحریروں کو دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے گھر کے تحریری کاغذات کو بھول گیا، جن کے بارے میں وہ اپنے والد سے پوچھنے آیا تھا۔ جاوید نے وہی موجود ایک شخص سے پاس کی قبر کے کتبے کی طرف اشارہ کر پوچھا: یہ کیا لکھا ہے؟

وقار احمد ابن اقتدار احمد، محلہ احمد نگر، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، تاریخِ وفات انیس دسمبر دو ہزار اکیس۔" اس شخص نے پڑھ کر سنایا۔ جاوید اپنے باپ کی قبر کے پاس جا کر اسے غور سے دیکھنے لگا جو بے نام تھی پھر دوڑ کر اپنی والدہ کی قبر کے پاس گیا وہ بھی بے نام۔ اس وقت اسکے ذہن میں بہت سے خیالات آئے، "میرے والدین کی قبروں پر کتبے کیوں نہیں؟ جو انہوں نے ماہ و سال گزارے انکے فتنوں کا شور تحریر کیوں نہیں؟ یہ اشرف المخلوقات ہیں اسکی نشانی کیا ہے؟ کیوں انہوں نے زمانے کی دھتکار سہی؟ اگر یہ دنیا ظالم ہے تو یہ بھی ظالم کیوں نہ بنیں؟ کیوں انہوں نے زندگی کے احکام کو نہ سمجھا؟ یہ زندہ رہے تو زندوں کی طرح کیوں نہ رہے؟ اب یہ مر گئے تو کیوں یہ مرنے والوں کی طرح نہیں؟" ایسے ہزاروں خیالات دماغ میں لئے وہ کبھی اپنے باپ کی قبر کی طرف دوڑتا کبھی ماں کی طرف، اسی دوڑ میں اسکے پاؤں کے نیچے پکی مٹی کا ڈیلا آگیا جاوید گر پڑا، اسکے سر میں پکی بنی قبر کا کونا دس گیا۔ اب جاوید بھی اپنے ماں باپ کی طرح خاموش اور بے نام پڑا تھا۔ احان یہ کہتے ہی خود بھی خاموش ہوگیا۔ میری بھی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کہہ سکوں۔

❑❑❑

وقار سیف
چچورنگاپلی روڈ، بنگلورو، کرناٹک
9648008681

تبصرہ

دیوار کے اُس پار

ڈاکٹر محمد صابر انصاری کا ناول ''دیوار کے اُس پار'' محض قصہ گوئی نہیں، بلکہ انسانیت کے دو مختلف رخوں کی ایک فلسفیانہ عکاسی ہے۔ مرکزی خیال: یہ ناول ایک ایسی ''دیوار'' کا تصور پیش کرتا ہے جو ایک طرف سچائی، ایمان اور رحم دلی کی دنیا ہے، اور دوسری طرف جھوٹ، خودغرضی اور نفرت کا اندھیرا ہے۔ یہ انسانی نفس کی کشمکش کو بیان کرتا ہے کہ انسان کو کن بنیادوں پر زندگی گزارنی چاہیے۔

پیغام: ناول کا مقصد قاری کو اس بات پر مجبور کرنا ہے کہ وہ ظاہری دولت وشہرت کو نہیں، بلکہ توبہ، محنت اور دوسروں کے لیے قربانی کو اپنی اصل طاقت سمجھے۔

اہمیت: ناول، فیضان جیسے کردار کے ذریعے یہ سکھاتا ہے کہ انسان غلطیوں کا اعتراف کر کے اور ایمان کی طرف رجوع کر کے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ حقیقی کامیابی کسی امتحان میں فتح حاصل کرنا نہیں، بلکہ نیک راہ پر ثابت قدم رہنا ہے۔ یہ کتاب سماجی برائیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے، انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی ایک بھرپور ادبی کوشش ہے۔ ''دیوار کے اس پار'' جن میں کرداروں اور مصنف کے نقطہ نظر کو مزید تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔

تہذیبی اور اخلاقی تفریق مقدمہ واضح کرتا ہے کہ دیوار صرف جغرافیائی فاصلہ نہیں ہے، بلکہ تہذیب وتمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ناول ہمیں زندگی کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر کے دکھاتا ہے: ایک حصہ وہ جہاں صبر، قناعت اور وفاداری کی قدر کی جاتی ہے، اور دوسرا وہ جہاں خودغرضی اور نفس پرستی حاوی ہے۔ یہ تقسیم افراد کی داخلی کشمکش کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ وہ ہر لمحہ نیک وبد کے درمیان انتخاب کر رہے ہیں۔

کرداروں کی علامتی حیثیت * فیضان: فیضان کا کردار ایک سرکش (باغی) انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو دنیاوی خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اس کی یہ تبدیلی کہ وہ'' توبہ، صبر اور زاہدو داری'' کی طرف آتا ہے، یہ دکھاتی ہے کہ انسان کو وقت، حالات اور آزمائش ہی صحیح راستے پر لاتی ہیں۔ یہ کردار اس بات کی تصدیق ہے کہ ہر انسان کے پاس گناہ کا اعتراف کرنے اور سنورنے کا موقع موجود ہے۔ * حاجی صاحب: ان کا ذکر ایک ایسے کردار کے طور پر کیا گیا ہے جو علم ودین کا سہارا لے کر معاشرے کو سنوارتا ہے۔ یہ کردار اس اصول کی عکاسی کرتا ہے کہ شریف اور نیک سیرت عورت (جیسے کہ صبر اور وفا کا پیکر) کی مدد سے ہی گھر کی بنیاد اور روح قائم رہتی ہے۔

انسان کی اصل طاقت مصنف نے بڑے زور کے ساتھ یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ انسان کی اصل طاقت دولت، شہرت یا بلند عہدہ نہیں ہے، بلکہ وہ خوبیاں ہیں جن کا تعلق روحانیت اور اخلاق سے ہے۔ یہ کہانی آپ کو سوچنے پر مجبور کرے گی کہ انسان کی اصل طاقت دولت، شہرت، یا بلند عہدہ نہیں، بلکہ توبہ، محنت اور دوسروں کے لیے قربانی ہے۔ یہ جملہ واضح کرتا ہے کہ ناول کا مقصد قاری کو مادی دنیا کی دوڑ سے ہٹا کر اندرونی تبدیلی کی طرف لانا ہے۔

قصہ گوئی کا مقصد مصنف (ڈاکٹر محمد صابر انصاری) کا زور اس بات پر ہے کہ ناول صرف دلچسپ واقعات سنانے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا سفر ہے جو قاری کو گناہ کی سنگینی کا احساس دلاتا ہے، اور بالآخر ایمان اور ضمیر کی روشنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جو زندگی کو واقعی میں خوشگوار بناتی ہے۔

□□□

کوائف

نام کتاب	:	دیوار کے اُس پار
مصنف	:	ڈاکٹر محمد صابر انصاری
مبصر	:	وقار سیف
ضخامت	:	252 صفحات
قیمت	:	-/350 روپئے
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

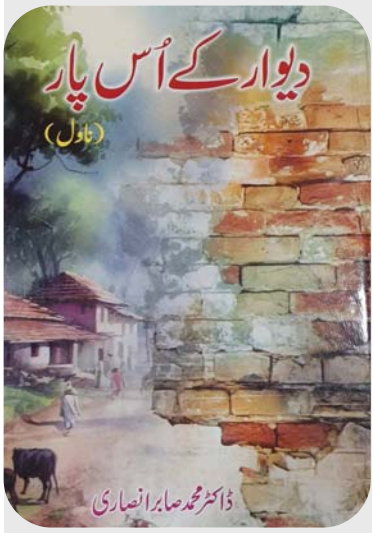

سید نازش احمد اُفق اعظمی
علی اپارٹمنٹ، پروفیسر کالونی عقب منجوٹنڈن ہاسپٹل، لکھنؤ
9305365035

ترقیات

اتر پردیش کھادی و دیہی صنعت ریاست کی ترقی کا ستون

اتر پردیش کھادی و گرام ادیوگ بورڈ دیہی معیشت کو مضبوط بنانے اور بے روزگاری کے خاتمے کے لیے ایک ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاست کی ترقی میں اس محکمے کا کردار کثیر الجہتی ہے، جس کا مقصد گاندھیائی فلسفے کے مطابق مواضعات کو خود کفیل بنانا ہے۔ ریاست کی ترقی میں اس کے اہم کردار کے چند نمایاں پہلو درج ذیل ہیں:

روزگار کی فراہمی (Employment Generation) اتر پردیش جیسے صوبے میں، جہاں بڑی آبادی مواضعات میں مقیم ہے، یہ محکمہ لاکھوں لوگوں کے لیے روزگار کا ذریعہ بنتا ہے۔ وزیر اعلیٰ گرام ادیوگ روزگار یوجنا: اس اسکیم کے تحت دیہی نوجوانوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے مالی امداد اور سبسڈی فراہم کی جاتی ہے۔ خواتین کی بااختیاری: چرخہ کاتنے اور دستکاری جیسے کاموں کے ذریعے دیہی خواتین کو معاشی طور پر آزاد بنایا جا رہا ہے۔

دیہی صنعتوں کا فروغ محکمہ صرف کھادی تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ مختلف چھوٹی صنعتوں کی سرپرستی کرتا ہے، جیسے: شہد کی مکھیوں کا پالن ہاتھ سے بنا کاغذ کمہار کا کام تیل نکالنے اور مسالوں کی پروسیسنگ کی اکائیاں۔

ماٹی کلا بورڈ کا قیام اتر پردیش حکومت نے روایتی مٹی کے کام کو زندہ کرنے کے لیے ماٹی کلا بورڈ تشکیل دیا ہے۔ اس کا مقصد دیوالی جیسے تہواروں پر مٹی کے دیے اور مورتیاں بنانے والے کاریگروں کو جدید آلات، تربیت اور مارکیٹ فراہم کرنا ہے تاکہ پلاسٹک اور چینی اشیاء کا متبادل فراہم کیا جا سکے۔ کھادی کی برانڈنگ اور جدید کاری اب کھادی صرف ایک کپڑا نہیں بلکہ ایک فیشن اسٹیٹمنٹ بن چکا ہے۔ محکمہ نے ڈیزائنرز کے ساتھ مل کر کھادی کو جدید لباس کی شکل دی ہے۔ کھادی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے سولر چرخوں کی تقسیم کی ہے۔ بڑے شہروں میں کھادی پلازہ اور نمائشوں کا انعقاد کیا ہے تاکہ کاریگروں کو براہ راست خریدار مل سکیں۔

ون ڈسٹرکٹ ون پروڈکٹ (ODOP) کے ساتھ ہم آہنگی اتر پردیش کی مشہور ODOP اسکیم کے ساتھ مل کر کھادی بورڈ مقامی مصنوعات کی پیکجنگ، مارکیٹنگ اور برآمدات میں مدد کرتا ہے، جس سے مقامی فن کو عالمی پہچان ملتی ہے۔ اتر پردیش میں کھادی اور دیہی صنعت کے کردار کو مزید سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات اہم ہیں، جو اس شعبے میں ہونے والی حالیہ تبدیلیوں اور ریاست کی معیشت پر ان کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں:

ٹیکنالوجی اور جدت محکمہ اب پرانے روایتی طریقوں سے نکل کر جدید ٹیکنالوجی اپنا رہا ہے: سولر چرخہ: کاریگروں کی محنت کم کرنے اور پیداوار بڑھانے کے لیے شمسی توانائی سے چلنے والے

چرخے فراہم کیے جا رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف بجلی کی بچت ہوتی ہے بلکہ بنکروں کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آن لائن مارکیٹنگ: کھادی کی مصنوعات اب صرف سرکاری اسٹورز تک محدود نہیں رہیں، بلکہ انہیں Amazon اور Flipkart جیسے ای کامرس پلیٹ فارمز پر بھی دستیاب کرایا جا رہا ہے تاکہ عالمی سطح پر خریدار مل سکیں۔

مالیاتی مراعات اور سبسڈی حکومت نے سرمایہ کاری کو آسان بنانے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے ہیں: پردھان منتری روزگار سرجن پروگرام: اس کے تحت دیہی علاقوں میں مینوفیکچرنگ یونٹ لگانے کے لیے 25 سے 35 فیصد تک سبسڈی دی جاتی ہے۔ سود میں رعایت: کھادی اداروں کو بینکوں سے لیے گئے قرض پر سود کا بڑا حصہ حکومت برداشت کرتی ہے، جس سے چھوٹے کاروباریوں پر بوجھ کم ہوتا ہے۔

تربیت اور مہارت کی ترقی (Skill Development) محکمہ مختلف تربیتی مراکز کے ذریعے دیہی نوجوانوں کو ہنرمند بنا رہا ہے: مٹی کے برتن بنانا، اگربتی بنانا، سلائی کڑھائی، اور فوڈ پروسیسنگ جیسے کاموں کی مفت تربیت دی جاتی ہے۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد کاریگروں کو جدید ٹول کٹس (جیسے الیکٹرک چاک یا سلائی مشینیں) بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ نمائشیں اور میلوں کا انعقاد مقامی کاریگروں کو اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرنا ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے، جسے محکمہ حل کرتا ہے: لکھنؤ، نوئیڈا اور دیگر بڑے شہروں میں کھادی مہوتسو کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان میلوں میں کروڑوں روپے کی فروخت ہوتی ہے، جس کا براہ راست فائدہ چھوٹے کاریگروں کو پہنچتا ہے۔

❑❑❑

جناب وزیر اعظم نریندر مودی، گورنر محترمہ آنندی بین پٹیل اور جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ''پریرنا استھل پارک'' میوزیم کا دورہ کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ ضرورت مندوں کو غذا اور کمبل تقسیم کرتے ہوئے۔

वर्ष : 79 अंक 10
फरवरी, 2025
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **आशिया ख़ातून**